مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی

علمائے سلف کے حالات کتابوں میں بہت پڑھے ہیں لیکن ایسے چند ہی بزرگوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جن کے اندر علم وعمل کا کمال نظر آیا۔ مولانا حیدر حسن رحمۃ اللہ علیہ انہی صاحبِ کمال بزرگوں میں تھے جن کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا اور کئی برس تک خلوت وجلوت اور سفر وحضر میں اُن کے ساتھ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، جس قدر ان کے حالات سے واقفیت ہوئی اسی قدر عقیدت میں اضافہ ہوا، اُن کا علمی تبحر ان کا زہد وتقویٰ، ان کا ذوقِ عبادت، ان کا شوقِ خدمت، اُن کا حُسنِ اخلاق، ان کا انکسار ان کی بے نفسی، ان کی مہمان نوازی، ان کی انسان دوستی، ان کا بزرگوں کا ادب، ان کی دوستوں پر نوازش، ان کی خوردوں پر شفقت، ان کی عالی ظرفی، ان کی بلند ہمتی، ان کی فیاضی، ان کا حسنِ سلوک، ان کی بے خوفی، اُن کی حق گوئی، اُن کا استغنا، ان کا توکل، ان کا امیروں سے احتراز، ان کا غریبوں کا خیال، محتاجوں کی حاجت روائی، تنگ دستوں کی دستگیری، کس کس بات کو یاد کیا جائے، اُن کا خیال کرتا ہوں تو بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے:۔ "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

مولانا نسلاً افغانی تھے اور اپنے پٹھان ہونے پر فخر کرتے تھے، اُن کے آبا و اجداد یاغستان میں عرصہ تک مقیم رہے، پھر وہاں سے اٹھارویں صدی میں ان کے بزرگ نجیب آباد (ضلع بجنور) آئے، یہ ہندستان میں بڑی ہل چل کا زمانہ تھا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی جنگ نے مرہٹوں کا زور توڑ دیا تھا اور توقع تھی کہ مغلوں کا بجھتا ہوا چراغ پھر روشن ہو جائے گا۔ احمد شاہ ابدالی نے ہندستان سے جاتے وقت دہلی کا تخت شاہ عالم کو سونپ دیا تھا اور نجیب الدولہ، شجاع الدولہ اور دوسرے سرکردہ امیروں کو ان کی امداد پر مامور کیا تھا لیکن امرا کی خود غرضی، بادشاہ کی نااہلی اور سرداروں کی باہمی چپقلش نے سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا، اور تین ہی سال کے اندر حالت ایسی ہو گئی کہ ۱۷۶۴ء میں مٹھی بھر انگریزوں نے شاہ عالم اور اُن کے ساتھیوں کو شکست دی اور بنگال سے دہلی تک سارے شمالی ہند کے ٹھیکہ دار بن گئے۔

مولانا کے پردادا غالباً ابدالی لشکر کے ساتھ ہندستان آئے، پھر نجیب الدولہ کے ساتھ نجیب آباد چلے گئے، لیکن جب روہیلوں کا اقتدار ختم ہو گیا، تو نجیب آباد کا قیام مناسب نہیں معلوم ہوا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں نواب امیر خاں نے ٹونک (راجستھان) میں اپنی ریاست قائم کی۔ امیر خاں بھی یاغستانی تھے، اور بنیر کے رہنے والے تھے۔ بنیر مولانا کا بھی آبائی وطن تھا۔ اس تعلق کی بنا پر مولانا کے دادا غلام حسین خاں نجیب آباد سے ٹونک آگئے، اور نواب امیر خاں کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنے لگے۔ غلام حسین خاں کے صاحبزادے احمد حسن تھے انھوں نے سپاہیانہ زندگی کے مقابلے میں علمی زندگی کو ترجیح دی۔ یہی مولانا احمد حسن خاں ہمارے مولانا کے والد تھے۔

۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ اُن سے پہلے اُن کے دو بھائی مولانا محمد حسن اور مولانا محمود حسن پیدا ہو چکے تھے۔ یہ دونوں بھائی عمر میں مولانا سے کافی بڑے تھے۔ مولانا کے بعد دو بھائی مولانا مظہر حسن خاں اور حکیم مسعود حسن خاں اور ہوئے۔ یہ سب بھائی علم و فضل میں ممتاز تھے۔ مولانا محمد حسن کو فقہ میں بڑا کمال تھا، وہ ریاست ٹونک کے مفتی مقرر ہوئے۔ مولانا محمود حسن غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ”معجم المصنفین“ کے نام سے بڑی عظیم الشان کتاب لکھی ہے، اس میں اسلام کے ابتدائی دور سے اپنے زمانہ تک کے مسلمان مصنفین کے حالات قلم بند

کیے ہیں۔ اُس کی چھے جلدیں دائرۃ المعارف حیدر آباد نے شائع کی ہیں، پوری کتاب چالیس جلدوں میں تمام ہوگی، یہ کتاب کیا ہے، مصنفین اسلام کی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ان کا ایک پُر مغز رسالہ "اصول توارث" بھی ہے، جس میں تعامل کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے، مجھے ان کی ملاقات کا شرف اور اُن کی باتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔

مولانا مظہر حسن خاں کو زبانوں کی تحقیق سے بڑی دل چسپی تھی، میسور کے کسی کالج میں پروفیسر تھے، انھوں نے ایک بڑی معرکہ کی کتاب لکھی ہے، جس میں عربی کو اُم الالسنہ ثابت کیا ہے۔ سب سے چھوٹے بھائی مسعود حسن خاں صاحب کو طب سے بڑی مناسبت تھی اور بڑے حاذق طبیب تھے۔ وہ دہلی میں باڑہ ہندو راؤ کے قریب رہتے تھے۔ مولانا حیدر حسن خاں صاحب جب دہلی تشریف لاتے، تو انہی کے مکان میں قیام کرتے۔ راقم الحروف کو ان کی ملاقات کا بھی شرف حاصل ہوا ہے، بڑے خلیق اور مہمان نواز تھے۔

مولانا نے ایک دین دار اور صاحبِ علم گھرانے میں آنکھیں کھولیں، اور اسی فضا میں پروان چڑھے، اس لیے علم کا شوق اور دین کا احترام خمیر میں داخل ہو گیا۔ بولنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہوئی، تو تعلیم شروع ہوئی۔ شروع میں بڑے بھائی مفتی محمد حسن خاں اور منجھلے بھائی مولانا محمود حسن خاں سے پڑھنے لگے۔ عمر ذرا آگے بڑھی، تو ٹونک ہی کے ایک اور عالم مولانا محمد حسن اور مولانا عبدالکریم سے درسی کتابیں پڑھنے لگے۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے بڑے بھائیوں کی طرح ان کی رفتار تعلیم زیادہ تیز نہیں تھی۔ اُن کے والد اپنے لڑکوں کے بارے میں بڑے اونچے خیالات رکھتے تھے کہ جلد از جلد علم کے اعلا مراتب تک پہنچ جائیں، اس لیے وہ اُن کی رفتارِ تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ ایک دن میں گھر میں کھانا کھا رہا تھا، اتنے میں والد صاحب آگئے، اور والدہ کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ مجھے حیدر حسن کے رنگ اچھے نظر نہیں آتے، پھر انھوں نے شہر کے بعض جاہل اور ناکارہ لڑکوں کا ذکر کیا، اور کہنے لگے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ انھیں کی طرح نہ ہو جائے، اور اپنے پڑھے لکھے بھائیوں کے درمیان جہالت

کی زندگی گزارے۔ اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ لڑکے باپ سے رعب اور فرطِ ادب کی بنا پر گفتگو نہیں کرتے تھے۔ عموماً ایسے مواقع پر ماں کی وساطت سے بات ہوتی تھی۔ والد تو اتنا کہہ کر چلے گئے، لیکن مولانا کے لیے ان کے الفاظ تیر و نشتر بن گئے۔ کہتے تھے کہ کھانا دشوار ہو گیا، فرطِ غم سے نوالے حلق میں پھنسنے لگے، دل میں تہیہ کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو علمی کمالات حاصل کر کے دم لوں گا۔

اس زمانہ میں ٹونک میں لاہور کے مدرسہ نعمانیہ اور اس کے صدر مدرس مولانا غلام احمد کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا نے دل میں ان سے اکتسابِ فیض کا پکا ارادہ کر لیا اور ماں سے زادِ راہ اور سفر خرچ کے لیے کچھ روپے لے کر لاہور روانہ ہو گئے اور یہ عہد کر لیا کہ جب تک خاطر خواہ تعلیم مکمل نہ کر لیں گے گھر واپس نہ آئیں گے۔

مولانا غلام احمد اپنے زمانہ کے بڑے نامور استاد تھے۔ کوٹ اسحٰق ضلع گجرانوالہ میں ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے، اور ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں لاہور میں وفات پائی۔ معقولات اور فقہ و اصول میں نادرۂ روزگار تھے، ریاضی میں بھی اعلا استعداد تھی۔ مولانا شاہ دین لدھیانوی مولانا عبداللہ ہوشیارپوری اور مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد تھے۔ مولانا شاہ دین استاذالعلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے اور مولانا غلام قادر مفتی صدرالدین خاں دہلوی اور مولانا محمد مظہر نانوتوی کے شاگرد تھے۔ اس طرح مولانا غلام احمد کی ذات میں اس زمانہ کے تمام مشہور تدریسی سلسلے میں جمع ہو گئے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے اُن کے کمالات کا بڑے شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر حکیم سید عبدالحئی رحؒ نے لکھا ہے کہ انھوں نے لاہور میں کئی بار اُن سے ملاقات کی تھی۔ وہ بڑے فاضل اور اعلا درجہ کے فقیہ تھے، بڑے عبادت گزار حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھے، خاموشی پسند تھے، مگر اس کے ساتھ اخلاقِ عالیہ کے مالک تھے۔ مولانا سید علی زینبی استاد اعلا مدرسہ فرقانیہ اور نائب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ان کی قابلیت کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ ہدایہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب مذاہب فقہاء کے بیان، عقلی و نقلی دلائل، اور وجوہ ترجیح کے اعتبار سے بڑی دقیق سمجھی جاتی ہے، اب تو مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے

حواشی کی وجہ سے اس کا پڑھنا نسبتاً آسان ہوگیا ہے، لیکن سادہ طور پر عبارت کا مطلب سمجھنے کے علاوہ فنی بصیرت اور علمی مہارت کے ساتھ اس کا درس دینا اب بھی بہت دشوار ہے۔ مگر مولانا عبدالحی کے حواشی سے پہلے تو ہدایہ کا پڑھانا لوہے کے چنے چبانے سے بھی زیادہ مشکل سمجھا جاتا تھا مولانا زینبی کہا کرتے تھے کہ مولانا غلام احمد کو اس کے مشکل مباحث نوک زبان تھے، اور مشکل مقامات کو اس خوبی سے حل کر دیتے تھے کہ لوگ عش عش کرنے لگتے تھے۔ ان کی قابلیت اور قادر الکلامی کا یہی حال منطق، فلسفہ اور ریاضی کے درس میں بھی تھا۔ اس علمی قابلیت کے ساتھ سادگی، انکسار حسن اخلاق اور شفقت و محبت کا پیکر تھے۔ بہت ہی سادہ لباس پہنتے، سادہ غذا کھاتے اور نشست و برخاست میں کسی امتیاز کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی لاہور سے گھر جاتے۔ ایک مرتبہ طبیعت ناساز تھی، سواری کے لیے ٹٹو لے لیا۔ مولانا حیدر حسن خاں ہمراہ تھے، مولانا غلام احمد کی طبیعت اچھی نہ تھی، مگر ان کی مساوات پسند طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ تنہا ٹٹو پر سوار رہیں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اتر پڑے اور کہا کہ مولوی جی اب تم سوار ہو جاؤ۔ مولانا حیدر حسن خاں نے عرض کیا میں آپ کا کمترین شاگرد اور ادنیٰ خادم ہوں، میری یہ مجال نہیں کہ آپ پیادہ پا ہوں اور میں سواری پر بیٹھوں۔ لیکن مولانا غلام احمد نے فرمایا نہیں مولوی جی تم کو بیٹھنا ہوگا۔ مولوی صاحب نے بہتیری منت سماجت کی، مگر مولانا غلام احمد نے ان کی ایک نہ سنی، اور جب تک ان کو سواری پر بٹھا نہ لیا، چین نہ آیا۔ اسی طرح باری باری اترتے چڑھتے اپنے وطن کوٹ اسحٰق پہنچے۔ مولانا حیدر حسن خاں نے اس واقعہ کو زندگی بھر یاد رکھا۔ واقعی تھا بھی یاد رکھنے کے لائق، حضرت عمرؓ کے سفر بیت المقدس کا منظر نگاہ کے سامنے آجاتا ہے۔

مولوی صاحب ان کی سادگی کا ذکر کرتے تھے، کہتے تھے کہ میرا کرتا ان کے کرتے سے لانبا ہوتا تھا، اور بعض اوقات لوگوں کو دھوکا ہوتا تھا، ایک مرتبہ پیر مہر علی شاہ سے ملنے گئے، انھوں نے مولانا غلام احمد کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا، سادہ لباس اور چھوٹے کرتے سے انھیں دھوکا ہوا اور استاد سے زیادہ شاگرد کی طرف ملتفت ہوئے۔ مولوی صاحب نے تعارف کرایا تو پیر صاحب کو اندازہ ہوا۔ اسی سفر کی بات ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ پیر صاحب

نے مولانا کو کھانا کھلایا، اور خاطر مدارات کی۔ مولانا غلام احمد کی خودداری اور عزتِ نفس کو گوارا نہ ہوا کہ مُفت کا کھانا کھائیں، رخصت ہوتے ہوئے کچھ روپے پیر صاحب کو نذر کیے۔ مزاج کی سادگی اور بے تکلفی کا یہ حال تھا کہ کسی وقت امتیاز کا خیال نہ آتا۔ عام آدمیوں کی طرح سے چلتے پھرتے، عام آدمیوں کی طرح سے رہتے سہتے، بازار جاتے کسی چیز کی ضرورت محسوس کرتے تو خریدتے بھی۔ کبھی جی چاہتا تو راستہ میں کچھ کھا بھی لیتے، کبھی گنا چوستے۔ مولوی صاحب کہتے بھی کہ آپ ایک ممتاز عالم اور شہر کے معزز فرد ہیں، اس طرح سرِ راہ لوگ کھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ پُرانے فقہانے بازار میں کھانے کو معیوب قرار دیا ہے وہ ایسے شخص کی شہادت معتبر نہیں سمجھتے۔ مولانا غلام احمد مسکرا کر فرماتے، مولوی جی ہمیں کہاں گواہی دینی ہے، ہم ان تکلفات میں اپنے کو تکلیف کیوں پہنچائیں۔ راستہ میں کہیں مجمع ہوتا، یا کوئی چیز قابلِ دید ہوتی تو رُک جاتے اور مولوی صاحب سے کہتے کہ دیکھ لو۔ مولوی صاحب عذر کرتے، تو فرماتے مولوی جی دیکھ بھی لو۔ دیہات میں یہ تماشے کہاں دیکھنے کو ملیں گے یہ طلبہ کے ساتھ ان کی غایت شفقت اور دل داری تھی، ورنہ اُن کے زہد و تقوا، عبادت و ریاضت اور متانت و سنجیدگی کی شہادت کوئی تذکرہ نویسوں کی زبان سے سُنے۔

مولانا حیدر حسن لاہور کے زمانۂ قیام میں آب ہوا کے فرق کی وجہ سے بیمار پڑے اور چھ مہینے تک بخار نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ فرماتے تھے کہ تم لوگ ہوتے تو اس بخار کو دق سمجھتے اور چارپائی پر پڑ جاتے۔ مگر میں نے اس بیماری کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ اور برابر اپنے کام میں لگا رہا اور دعا کرتا رہا کہ گھر سے جو عہد کر کے آیا ہوں اللہ اسے پورا فرمائے، اور میں کامیاب ہو کر سرخروی کے ساتھ وطن واپس جاؤں۔

مولانا پٹھان تھے، اور پٹھانی آن بان اُن میں ہمیشہ رہی۔ چاہے جان چلی جائے مگر آن میں فرق نہ آئے، یہ کبھی اُن کے ذہن سے فراموش نہیں ہوا۔ کوئی انھیں کمزور سمجھے یہ کبھی گوارا نہ تھا۔ بڑھاپے میں بھی اُن کی ہمت کے سامنے جوانوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔ لاہور میں تو نو عمر تھے، پھر بھلا شدائد کے سامنے کس طرح سپر افگندہ ہوتے، پنجاب کی سردی مشہور ہے، جاڑوں میں اچھے اچھوں کے دانت بجنے لگتے ہیں، لیکن مولانا دسمبر جنوری کی شدید سردی میں بھی ایک سوتی چادر پر اکتفا کرتے۔ کہتے تھے کہ مجھے شرم آتی تھی کہ جوان ہو کر سردی مناؤں۔

اگر روئی کی رضائی یا اون کا کمبل اوڑھوں تو لوگ کیا کہیں گے، کہ جوانی میں اون اور روئی کا محتاج ہے۔ یہ شان ان کی بڑھاپے تک قائم رہی۔ شدید سردی میں بھی ایک شلوکے سے زیادہ نہیں پہنتے تھے، اور اُس کے بھی بٹن کھلے رہتے تھے۔ آخر عمر میں جب سن زیادہ ہوگیا تھا تو ہم لوگ بٹن بند کرنے لگتے۔ تو فرماتے میاں کبھی ایسا نہیں کیا۔ جب ہم لوگ، اس کے باوجود نہ مانتے تو پھر خاموش ہو جاتے۔ میں جب کبھی جاڑوں میں اُن کا مہمان ہوتا، تو کہتے اس کو جاڑا بہت لگتا ہے، اس پر دو لحاف ڈال دو۔ مولانا کچھ عرصہ سرحدی علاقہ میں بھی رہے تھے، جہاں جاڑوں میں پانی جم جاتا ہے۔ کہتے تھے کہ بارہا ایسا ہوا کہ پچھلے پہر تہجد کے وقت ندی میں برف توڑ توڑ کر غسل کرنا پڑا۔ شاید اسی وجہ سے وہ سردی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی کو بہت اوڑھے پہنے دیکھتے تو بہت تعجب کرتے تھے۔

نواب علی حسن خان ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں آمد و رفت رہتی تھی، اُن کے والد نواب صدیق حسن خاں بھی شیخ حسین کے شاگرد تھے، بھوپال کے قیام کے زمانہ میں نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے علمی انہماک اور دین داری کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ اگرچہ نواب صاحب اہلِ حدیث تھے اور مولانا شدید حنفی، مگر با ایں ہمہ نواب صاحب کی قدر کرتے تھے اور ان کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ نواب صاحب روزانہ ایک جزو تصنیف کر لیتے تھے۔ کبھی کسی کے یہاں کسی تقریب یا دعوت میں جاتے اور کھانے میں دیر ہوتی تو وہیں تصنیفی کام شروع کر دیتے۔ علما اور طلبہ کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور ان کی خدمت باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ ہر جمعرات کو ان کے یہاں علما اور طلبہ کی دعوت ہوتی تھی اس موقع پر نواب صاحب بنفس نفیس خود سب کے ہاتھ دھلاتے اور یہ پانی برکت کے لیے گھر کے کونوں میں ڈلواتے۔ نواب صاحب سے محبت اور تعلق خاطر کی بنا پر مولانا ان کی اولاد اور اہلِ خاندان سے ربط ضبط رکھتے تھے، چنانچہ جب مولانا لکھنؤ آئے تو نواب علی حسن خاں اور ان کے دوسرے اعزّہ سے ملنے بھوپال ہاؤس جایا کرتے تھے۔ اس مجلس میں نواب علی حسن خاں صاحب کے برادر نسبتی نواب رشید الدین عرف اچھے صاحب بھی ہوتے تھے۔ وہ جاڑوں میں سردی سے حفاظت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ مولانا کہتے تھے کہ ایک رات گیا تو وہ اتنا اوڑھے پہنے تھے کہ میں نے کہا ساری سردی انھیں پر پھٹ پڑی ہے، اس وقت میں حسبِ عادت صرف شلوکا پہنے ہوئے تھا۔ اچھے صاحب بار بار مجھے تعجب سے دیکھتے اور کہتے صرف ایک شلوکا پہنے ہیں، آپ کو جاڑا نہیں لگتا، ابھی تو آپ کو ندوہ تک جانا ہے، کھلے میدان میں کیا ہوگا، سردی

غضب کی ہے۔ ان کے سوالات اور تعجب انگیز نظروں کو دیکھ کر میں نے اپنے جی میں کہا آج یہ نظر لگا کر رہے گا۔ مولانا نظر کے اثر اور مکان کی نحوست کے بڑے قائل تھے، اس سلسلہ میں وہ حدیثوں سے استدلال کرتے تھے، حالانکہ محدثین نے ان کے دوسرے معانی بیان کیے ہیں اسی طرح سواری اور عورت کے بارے میں بھی نحوست کے معانی شرارت اور بدمزاجی وغیرہ بتلائے ہیں، لیکن مولانا کو اتفاق سے کچھ ایسے تجربے ہوئے تھے کہ وہ ان توجیہات کے بجائے نحوست ہی مراد لیتے تھے۔

لاہور میں مولانا غلام احمد کے یہاں انھوں نے کئی برس قیام کیا، اور جب سارے مروجہ علوم حاصل کر لیے تو سند فراغ حاصل کی۔ واپسی میں استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ کے حلقۂ درس میں بھی کچھ عرصے شریک رہے، اُن کے وفورِ علم، قوتِ بیان، حسنِ کلام اور انہماک اور دولہ کا برابر ذکر کرتے رہتے تھے۔ حدیث شریف کی متداول کتابیں اگرچہ لاہور میں پڑھ لی تھیں، لیکن کسی صاحبِ نظر محدث کے درس میں بیٹھنے کی فکر تھی۔ اس زمانہ میں دہلی میں میاں سید نذیر حسین کے درس حدیث کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا وہاں پہنچے اور کچھ عرصہ تک ان کے حلقۂ درس میں شریک رہے۔ لیکن مولانا فقہ حنفی سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے، اور میاں صاحب پر اس زمانہ میں عدم تقلید کا غلبہ تھا، اس لیے مولانا کا وہاں جی نہ لگا ایک دن میاں صاحب سے کہنے لگے آپ کی تقریر سے تو برابر یہ ثابت ہوتا رہتا ہے کہ احناف کے دلائل کمزور اور ان کی مستند حدیثیں ضعیف ہیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا حنفی ضعیف روایتوں ہی پر عمل کرتے ہیں؟ یہ کیونکر ممکن ہے۔ مولوی صاحب ابھی طالب علم تھے، حدیث ورجال پر ان کی زیادہ نظر نہیں تھی، میاں صاحب کے سامنے دلائل کیا پیش کرتے، اپنے مسلک کی محبت میں جذباتی انداز میں یہ بات کہی تھی۔ میاں صاحب کو یہ انداز پسند نہیں آیا، فرمایا پٹھان بڑے جاہل ہوتے ہیں۔ اب حنفیت کے ساتھ پٹھانیت بھی زد میں آگئی بولے میں تو عالم پٹھان ہوں۔ اس گفتگو کے بعد طبیعت اور اُچاٹ ہوگئی۔

اس زمانہ میں دہلی کے علاوہ بھوپال بھی حدیث شریف کا بڑا مرکز تھا، وہاں شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی (یمن ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ — بھوپال ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹) درس دیتے تھے۔ ان کی حدیث دانی کی سارے ملک میں شہرت تھی، اور گوشہ گوشہ سے طالبین حدیث ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ شیخ صاحب بھی حنفی نہ تھے۔ وہ امام شافعی کے پیرو تھے، مگر مزاج میں بہت اعتدال تھا۔ انداز بحث عالمانہ ہوتا تھا، مختلف ائمہ کے مذاہب بیان کرتے تھے، ہر ایک کے دلائل بھی دیتے

تھے، لیکن طرزِ گفتگو ایسا ہوتا تھا کہ کسی کو ناگوار نہیں ہوتا تھا۔ حنفی شافعی مالکی، حنبلی، اہلِ حدیث وغیرہ سب ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے لیکن تحقیق و تدقیق اور اخذ و ترک میں مختار ہوتے۔ ہر طرح کی کتابیں موجود ہوتیں، اور طلبہ براہِ راست ماخذ سے استفادہ کر سکتے تھے۔ مولانا حیدر حسن خاں صاحب کو شیخ صاحب کا یہ اندازِ تدریس بہت پسند آیا، اور ان کے ایسے گرویدہ ہوئے، کہ پھر کہیں اور کا رُخ نہیں کیا اور شیخ کا دامن مستقل طور پر تھام لیا۔ اگرچہ حنفیت پر مستقل طور پر جمے رہے مگر ہمیشہ دلائل پر نظر رہی اور تاویل و توجیہ کے بجائے محدثین کے طرز پر حدیث و اسماء الرجال کی کتابوں سے کام لیتے تھے، اور اسی انداز میں روایات پر بحث اور جرح و تعدیل کرتے تھے۔ وہ شیخ صاحب کا والہانہ ذکر کیا کرتے تھے، کہتے تھے، ان کو بخاری کی شروح ازبر تھیں، علامہ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری تو ہر وقت زبان پر رہتی تھی۔

شیخ حسین کے یہاں جی لگا کر حدیث پڑھی، شیخ بھی اُن کی محنت و سعی ذوق و شوق، فہم و فراست تلاش و تحقیق مطالعہ و مذاکرہ فکر و نظر سلامت طبع، پرہیزگاری و نیک عملی اور اطاعت و فرمانبرداری سے بہت خوش رہتے تھے، فراغت کے بعد اُنھیں درسِ حدیث کی اجازت دی، اور خود اپنے ہاتھ سے سند لکھ کر دی، اور فلاحِ دارین کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، علوم متداولہ اور فنونِ مروجہ کی تحصیل وہ لاہور میں پہلے ہی کر چکے تھے، حدیث کی تکمیل کے بعد انھیں یک گونہ اطمینان ہوا اور ٹونک واپس آئے۔

ٹونک اُس زمانہ میں علم کا مرکز تھا۔ شاہی خاندان اپنی دینداری اور اہلِ علم کی قدردانی میں مشہور تھا۔ نواب وزیر الدولہ حضرت سید احمد شہید کے مُرید تھے انھوں نے بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت کے بعد اُن کے اہلِ خاندان اور مُریدین و متوسلین کو ٹونک میں آباد کیا، اور مصارف کے لیے جاگیریں دیں۔ قافلۂ مجاہدین کی مناسبت سے اس محلہ کا نام ہی قافلہ پڑ گیا۔ نواب وزیر الدولہ کی سید صاحب سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کے اعزہ و اقرباء کو اپنے اہلِ خاندان پر ترجیح دیتے تھے۔ مولوی صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ نواب صاحب کو معلوم ہوا کہ سید صاحب کے داماد دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں بُلا کر کہا کہ دوسری بیوی آئے گی تو صاحبزادی کو تکلیف ہوگی لیکن اگر آپ شادی سے باز نہیں رہ سکتے تو کسی اور عورت کے بجائے میری لڑکی سے عقد کر لیجیے، وہ صاحبزادی کی سوکن نہیں بلکہ خادمہ بن کر رہے گی۔

نواب صاحب نے سید صاحب اور ان کے رفقا کے حالات اور جہاد کے واقعات مستند عینی

شاہدوں سے بڑی تفصیل سے لکھوائے تھے، جو سید صاحب اور ان کی تحریک جہاد کے بارے میں لکھنے والوں کے لیے اہم ماخذ ہے۔ نواب صاحب کی دینداری کا اثر ان کے سارے خاندان پر تھا، اور سب عقیدہ کی صحت، عمل کی درستی، علم کی قدر اور علما کی عقیدت میں ممتاز تھے۔ مولوی صاحب کے زمانہ میں نواب وزیرالدولہ تو نہ تھے مگر ان کے جانشین اور اہلِ خاندان علم کی اشاعت اور علما کی قدردانی کا وہی جذبہ رکھتے تھے۔

نواب ابراہیم علی والی ریاست تھے، اس زمانہ میں ٹونک میں دو اہم درسگاہیں تھیں۔ ایک کا نام مدرسہ خلیلیہ تھا، اور دوسرے کا ناصریہ۔ مدرسہ خلیلیہ کے صدر المدرسین مولانا عبدالحق خیرآبادی کے نامور شاگرد حکیم برکات احمد صاحب تھے اور اس کے سرپرست نواب ابراہیم علی خاں تھے۔ مدرسہ ناصریہ کے سرپرست نواب صاحب کے بھائی صاحبزادہ عبدالرحیم صاحب تھے۔ ٹونک کے امرا میں جتنی دینداری اور خاکساری تھی اس کا یقین کرنا دشوار ہوتا اگر آنکھوں سے اس دور کی جھلک نہ دیکھی ہوتی۔ میں اودھ کے تعلقداروں کے جاہ و جلال کو دیکھ چکا تھا ایک بار اجب ٹونک گیا اور وہاں کے جاگیرداروں اور نواب صاحب کے اہلِ خاندان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو ان کے انکسار اور سادگی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

صاحبزادہ عبدالرحیم کے جذبۂ دینی نے مدرسہ ناصریہ کو علوم دینیہ اور فنونِ عقلیہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ ان کی قدردانی سے وہاں بہت سے ذی استعداد مدرس جمع ہو گئے تھے۔ مولانا حیدر حسن خاں تکمیل علوم سے فارغ ہو کر ٹونک پہنچے تو صاحبزادہ صاحب کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور انھیں بھی تدریس کی خدمت سپرد کر دی۔ مولوی صاحب ابھی نووارد تھے مگر جلد ہی ان کی صلاحیت و استعداد کے جوہر کھلنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی مہارت فن اور قوت تدریس کی دھوم مچ گئی۔ ٹونک اہلِ کمال کا مجمع تھا اور مولانا سیف الرحمٰن جیسے ذہین و طباع، صاحب فکر و نظر اور نکتہ سنج و خوش بیان استاد موجود تھے، ایسے حالات میں کسی نئے آدمی کی دال گلنا مشکل تھی۔ مگر چند ہی مہینے میں سربرآوردہ علما اور برسوں کے منجھے ہوئے اساتذہ مولانا حیدر حسن خاں کی استعداد کے قائل ہو گئے اور طلبہ کھنچ کھنچ کر ان کے درس میں جمع ہونے لگے۔

مولانا سیف الرحمٰن اصلاً افغانستان کے باشندہ تھے۔ وہیں پہلے پڑھے اور متوسطات تک تعلیم حاصل کی، پھر اعلا تعلیم کے لیے ہندستان آئے اور مولانا لطف اللہ سے علی گڑھ میں رہ کر استفادہ کیا۔ پھر مولانا رشید احمد گنگوہی سے حدیث شریف کی مکمل تعلیم حاصل کی۔ اور ان کی خدمت

میں کچھ عرصہ ٹھہر کر اکتساب فیض کیا۔ پھر ٹونک آئے۔ وہیں شادی کی اور مدرسہ ناصریہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ بہت عرصہ تک وہاں درس دیتے رہے۔ پھر دہلی آئے اور مدرسہ فتح پوری میں استاد ہو گئے۔ ان کو انگریزوں کا تسلّط ناپسند تھا اور ان سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جذبۂ جہاد دل میں رکھتے تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی صحبت میں اس جذبہ کو تقویت ہوتی اور ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۴ء) میں ان کے اشارہ سے سرحد پہنچ گئے اور حاجی ترنگ زئی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے جہاد شروع کیا۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو کابل واپس چلے گئے۔ انگریزوں نے امیر حبیب اللہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ سیف الرحمٰن کو ان کے حوالہ کر دیں، اس لیے مولانا وہاں سے یاغستان چلے گئے۔ جب امان اللہ خان بادشاہ ہوئے تو پھر کابل واپس آئے، اور معزز خدمات پر مامور رہے۔ ہندستان کی آزادی کے بعد پشاور چلے گئے اور وہیں اپنے گاؤں متھرا نو میں ۱۳۶۹ھ (۱۹۴۹ء) میں وفات پائی۔ مولانا حیدر حسن خاں صاحب ان کی ذہانت، علمی صلاحیت اور مجاہدانہ جذبات کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے۔

مدرسہ ناصریہ کی ملازمت کے زمانہ میں مولانا حیدر حسن کو حج کرنے کا موقع مل گیا اور فریضۂ حج کی ادائگی اور مدینہ منورہ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس سلسلے میں حرمین شریفین کے فیوض و برکات سے مستفید ہونے کے علاوہ بہت سے علما مشائخ سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ ان سے تفسیر و حدیث فقہ و اصول اور اخلاق و تصوف کے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ بہت سی نایاب کتابیں نظر سے گزریں جن سے علم و فن کے نئے نئے گوشے سامنے آئے۔ علمائے حرمین کی مجالس درس میں بھی شریک ہوئے اور ان کے افکار و خیالات اور ان کے طریقۂ درس سے واقفیت حاصل کی۔

مولانا کو ایک عرصہ سے خیال تھا کہ کسی صاحب نسبت بزرگ سے بیعت ہو جائیں ہندستان میں بہت سے بزرگ موجود تھے بعض بزرگوں سے ملاقات بھی کی تھی مگر ابھی تک کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بچپن سے کانوں میں پڑا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچے تو ان کی زیارت کی خواہش ہوئی، حاضر خدمت ہوئے تو بہت متاثر ہوئے، اور دل نے کہا کہ اسی آستانہ کو عقیدت کا مرکز بنانا چاہیے۔ حاجی صاحب سے درخواست کی کہ داخل سلسلہ فرما لیجیے، ان کو بھی ان کے اندر طلب صادق نظر آئی اور حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔ ایک

سال تک مولانا جم کر حاجی صاحب کی خدمت میں رہے اور ان کی ہدایت کے مطابق اذکار و اشغال میں مصروف رہے اور اس راہ میں ایسی صلاحیت پیدا کرلی کہ حاجی صاحب نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔ مولوی صاحب نے اس موقع پر عرض کیا کہ حضرت میں تو درس و تدریس میں مشغول رہتا ہوں، اس بارے میں آپ کا کیا حکم ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا آپ بہت اچھا کام کر رہے ہیں اس مبارک مشغلہ میں لگے رہیے۔ اس کے ساتھ کچھ اوراد و اذکار کی تلقین کی، ایک خاص نصیحت یہ کی کہ امراء سے تعلق نہ رکھیے اور ان کی صحبت سے دور رہیے۔

مولوی صاحب نے مرشد کی یہ ہدایت گرہ میں باندھ لی اور ساری زندگی اس پر عمل کرتے رہے، سفر و حضر، آرام و تکلیف کسی حال میں تہجد کی نماز ترک نہیں کی، نہ ان اوراد و اشغال میں کبھی فرق آنے دیا جن کی بجاآوری کی حاجی صاحب نے تاکید کی تھی۔ کچھ رات رہے بیدار ہو جاتے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ تہجد پڑھتے، اس میں ان کی قرارت بڑی موثر ہوتی، طویل قیام کے ساتھ رکوع و سجود بھی طویل کرتے، رکعتیں پوری کرنے کے بعد صبح تک وظائف میں مشغول رہتے، صبح کی نماز اوّل وقت، اندھیرے (غلس) میں پڑھتے، اس میں بھی طویل سورتیں پڑھتے اور انھیں کی مناسبت سے رکوع و سجود بھی دیر تک کرتے رہتے اگر کوئی رکوع کی حالت میں پہنچتا تو اطمینان سے سنّتیں پڑھ کر رکوع میں شریک ہو جاتا اور تیز رفتار اشخاص تو وضو بھی کر لیتے۔ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک چہرہ پر ایک کپڑا ڈال لیتے اور حاجی صاحب کے تلقین کردہ ایک خاص وظیفہ میں مصروف رہتے، پھر اشراق کی نماز پڑھ کر اپنے کاموں میں لگتے۔

حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ امیروں سے تعلق نہ رکھنا، ان سے ملنے میں دین کا ضرر ہوتا ہے۔ اس ارشاد پر اس شدت سے عمل کیا کہ کبھی کسی امیر یا والی حکومت کا مُنہ تک نہیں دیکھا۔ مولانا ٹونک کے باشندہ تھے۔ ریاستوں کے حالات سے جو لوگ واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں اس ہدایت پر عمل کتنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب ہندستان میں آزادی کی تحریک کا زور تھا تو ٹونک کے باشندوں نے بھی آزادی کا مطالبہ کیا۔ اس تحریک میں سادات، قافلہ پیش پیش تھے۔ چند دن آزادی پسندوں کا زور رہا پھر نواب نے اپنی وفادار فوج کی مدد سے اپنے اقتدار کو مستحکم کر لیا۔ سادات کی جائدادیں ضبط ہوئیں اور انھیں ریاست سے خارج کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کے سادات سے دیرینہ تعلقات تھے، ان میں ان کے دوست اور عزیز شاگرد تھے، اس بنا پر ان کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ شہر کے دوسرے مشتبہ لوگوں نے نواب صاحب اور ان کے متوسلین سے مل کر اپنی صفائی پیش کی اور وفاداری

کا یقین دلایا، مگر مولوی صاحب نواب صاحب کی خدمت میں نہ گئے۔ ان کے ہمدردوں نے ان کی طرف سے صفائی پیش کی۔ نواب صاحب نے کہا اچھا انھیں میرے پاس لے آؤ ان لوگوں نے بڑی منت سماجت کی اور عرض کیا کہ اس وقت نواب صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ بدظن ہو جائیں گے، مگر مولوی صاحب مرشد کی نصیحت کو نظرانداز کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ جتنی تاخیر ہوتی جاتی تھی اسی قدر بدظنی میں اضافہ کا امکان بڑھتا جاتا تھا۔ نواب صاحب کے مقربین میں جو لوگ مولوی صاحب کے ہمدرد تھے انھوں نے نواب کو ان کی خیرخواہی کا یقین دلایا لیکن نواب صاحب نے کہا یہ کیسا خیرخواہ ہے جو میری صورت سے بیزار ہے۔ حالات بے حد خطرناک تھے مگر مولوی صاحب حاجی صاحب کی ہدایت پر جمے رہے۔ بالآخر ان کے بھائیوں اور عزیزوں نے مشورہ دیا کہ نواب صاحب سے نہیں ملتے ہو تو پھر گھر بار چھوڑ کر ریاست سے باہر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ کئی برس تک ٹونک نہیں گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ نواب صاحب بہت بیمار ہوئے، مشیروں نے مشورہ دیا کہ ریاست کے تمام علما و مشائخ آیات شفا پڑھ کر نواب صاحب پر دم کریں۔ اس موقع پر بھی مولوی صاحب نے گریز کرنا چاہا مگر دوستوں نے سمجھایا کہ یہ بڑا نازک وقت ہے، سب لوگ دم کرنے جا رہے ہیں، آپ نہ گئے تو بدگمانی ہوگی۔ جب لوگوں نے بہت سمجھایا تو گئے اور آیتیں پڑھ کر دم کر دیں مگر نواب کے چہرہ پر نظر نہیں ڈالی۔

نواب ابراہیم علی خاں کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں ان کے جانشین ہوئے تو ان کے ساتھ بھی مولوی صاحب کا یہی معاملہ رہا۔ بے تعلقی کی وجہ سے مولوی صاحب ان کو پہچانتے بھی نہ تھے۔ ایک تقریب میں مولوی صاحب شریک تھے، نواب صاحب بھی آ گئے، مولوی صاحب نے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا اس لیے پہچان نہ سکے مگر جب صاحب خانہ نے بتایا تب بھی ملنے کی کوشش نہیں کی۔ مولوی صاحب کا زندگی بھر یہی معمول رہا اور اس بارے میں کسی مصلحت یا خوف کی کبھی پروا نہیں کی۔ اگر کسی دوسرے میں بھی یہ بات دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی امرا اور والیان ملک سے ربط ضبط پسند نہیں کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند انھیں بہت عزیز تھا، اس کی خدمت میں انھوں نے اپنی زندگی لگا دی تھی، اس کے مصارف کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی بڑی کوشش کرتے تھے مگر اس غرض سے امیروں اور حکمرانوں کے در دولت پر دستک دینے کے بجائے عوام سے چندہ مانگنا پسند کرتے تھے اور اس کو باعث خیر و برکت

سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب ان کی اس روش سے بہت خوش تھے، فرماتے تھے کہ ایک بار وہ رام پور آئے، شہر میں ان کا بڑا پُر اثر وعظ ہوا جس میں بکثرت لوگ شریک ہوئے، اس موقع پر انھوں نے دارالعلوم کے لیے عوام سے چندہ کی اپیل کی اور خاصی رقم جمع ہو گئی۔ نواب کلب علی خاں اس وقت زندہ تھے۔ ان کی داد دہش کا بڑا شہرہ تھا، لوگوں نے توجہ بھی دلائی، بلکہ یہ بھی کہا کہ نواب صاحب ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے مگر مولانا قاسم نے معذرت کر دی۔ مولوی صاحب اس واقعہ کو بیان کرتے تو بہت خوش ہوتے۔

مولوی صاحب والیانِ ملک کے علاوہ دوسرے اغنیا و اہلِ ثروت اور اصحاب جاہ و حشم سے بھی راہ و رسم پسند نہیں کرتے تھے۔ والیانِ ملک کی طرح ان کی صورت دیکھنے سے احتراز تو نہ تھا مگر ربط وضبط کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ علماءِ نامدار اور مشائخ ذی شان کی ملاقات سے بھی حتی الامکان اجتناب کرتے تھے کہتے تھے کہ یہ لوگ ہمہ وقت اپنے کو لیے دیے رہتے ہیں نشست و برخاست، چال ڈھال اور بات چیت سب میں ان کی ایک خاص شان ہوتی ہے ایسے لوگوں سے مل کر مجھے خوشی نہیں ہوتی۔ لیکن جو لوگ تمکنت سے پاک ہوتے اور خلوص سے ملتے ان کی قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی کام سے رام پور تشریف لے گئے۔ سامان سرائے میں رکھ دیا۔ پھر مولانا فضل حق (رامپوری) سے ملنے مدرسۂ عالیہ گئے وہ بڑے تپاک سے ملے پھر پوچھا سامان کہاں ہے؟ یہ سُن کر کہ شہر میں ہے، کہا مجھ سے زیادہ آپ کی میزبانی کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر آدمی بھیج کر فوراً سامان منگوایا، مولوی صاحب نے کہا میں مولویوں سے مل کر کم ہی خوش ہوتا ہوں مگر آپ سے مل کر جی خوش ہو گیا یہ حسن اخلاق کہاں سے آیا۔ فرمایا کہ میں نہ پیر ہوں نہ بڑا آدمی، پھر رام پور کا پانی بھی اخلاق گر ہے۔ اس ملاقات کے بعد مولوی صاحب مولانا فضل حق کے گرویدہ ہو گئے اور زندگی بھر ان کی خوبیوں کا ذکر کرتے رہے۔

سفرِ حج سے واپسی کے بعد حسب سابق مدرسہ ناصریہ میں پڑھانے لگے لیکن اب ان کی شہرت ٹونک ہی تک محدود نہ تھی بلکہ دور دور ان کا نام پہنچ گیا تھا۔ ملک کے دوسرے مدارس کے منتظمین کی ان پر نظر پڑنے لگی اور زیادہ مشاہرہ پر طلب کیے جانے لگے، لیکن ان کی وفاداری اور قناعت پسندی نے ٹونک سے باہر قدم نکالنے کی اجازت نہ دی۔ ناظم ندوۃ العلما حکیم سید عبدالحی صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے ان کی صلاحیت کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا۔ وہ بھی مولانا لطف اللہ، مولانا غلام احمد اور شیخ حسین کے حلقۂ درس میں بیٹھ چکے تھے، انھیں مولانا کی لیاقت

کا پورا علم تھا، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ مولانا دارالعلوم ندوۃ العلما کی مسند درس کو زینت بخشیں۔ حکیم صاحب مرحوم کی ٹونک میں عزیزداری تھی۔ ان کے عزیزوں سے مولانا کے گہرے روابط تھے انھوں نے ان سب وسائل سے کام لیا لیکن صاحبزادہ عبدالرحیم سے مولانا کو ایسا تعلق خاطر تھا اور ان کے دینی جذبہ مذہبی شوق اور علمی قدردانی سے اتنے متاثر تھے کہ کسی طرح مدرسہ ناصریہ سے علاحدہ ہونے اور ٹونک چھوڑ کر باہر جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ بہرحال حکیم صاحب کا اصرار جاری رہا۔

۱۰ مئی ۱۹۲۱ء (یکم رمضان ۱۳۳۹ھ) کو صاحبزادہ عبدالرحیم کا انتقال ہوگیا۔ ادھر ندوہ میں شیخ الحدیث کی جگہ خالی تھی۔ مولانا سید امیر علی کی وفات ہو چکی تھی اور شیخ محمد عرب بھی جا چکے تھے۔ حکیم صاحب کو پھر مولانا کا خیال آیا اور بڑے اصرار سے بلایا اس مرتبہ وہ انکار نہ کر سکے۔ اس موقع پر ان کو اپنے محبوب استاد مولانا غلام احمد کی وصیت یاد آئی جو انھوں نے آخری بار بڑی تاکید کے ساتھ کی تھی۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ میں جب واپس آنے لگا تو حسب معمول کچھ دور تک ساتھ آئے جب رخصت ہو کر آگے بڑھا تو پھر آواز دی میں حاضر ہوا تو فرمایا مولوی جی ایک نصیحت کرتا ہوں اس کا خاص خیال رکھنا، دیکھو حدیث شریف سے زیادہ اشتغال رکھنا اور اس کے درس کو سرمایۂ سعادت سمجھنا۔ ناظم ندوۃ العلما نے دارالعلوم آنے کی دعوت دی اور خاص طور سے درس حدیث کی درخواست کی تو مولوی صاحب کو خیال ہوا کہ یہ خدا کی طرف سے استاد کی وصیت کی تعمیل کا موقع مل رہا ہے۔ یہ سوچ کر راضی ہو گئے اور منظوری کا خط لکھ دیا۔

ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (اگست ۱۹۲۱ء) میں لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ اہل و عیال ساتھ نہیں تھے، سامان بھی زیادہ رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کو ہلکا پھلکا رہنا چاہیے، ملازمت کا کچھ اعتبار نہیں، معلوم نہیں کس دن ملازم رکھنے والوں کا دل بھر جائے، یا اپنا ہی جی نہ لگے۔ آدمی کے ساتھ زیادہ جھمیلا نہ ہوگا تو آسانی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوگا، ورنہ زحمتیں پیش آئیں گی۔ ناظم صاحب دارالعلوم ندوۃ العلما نے درسگاہ کے ایک حصہ میں مولانا کے قیام کا انتظام کر دیا اور حدیث کی اونچی کتابوں کی تعلیم ان کے سپرد کر دی۔

اس زمانہ میں ندوہ کے مہتمم (پرنسپل) مولانا حفیظ اللہ صاحب تھے۔ حدیث سے ان کو بھی خاص شغف تھا۔ عموماً صحیح مسلم وہی پڑھاتے تھے۔ ان کا درس سادہ ہوتا تھا۔ حدیث کا مطلب بتا دیتے تھے لیکن مختلف فقہا کے مذہب بیان کرنے اور ان کے دلائل فراہم کرنے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد کا درس مولانا حیدر حسن خاں کے سپرد کیا گیا۔ مولانا صاحب حنفی تھے، امام ابوحنیفہؒ سے ان کی عقیدت عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ اکثر خواب میں امام صاحب کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے تھے۔ کسی پیچیدہ مسئلہ میں جب دلائل خاطر خواہ سمجھ میں نہ آتے اور اسی اُدھیڑ بُن میں آنکھ لگ جاتی تو امام صاحب کو دیکھتے اور کچھ ایسی باتیں ہوتیں یا ایسے حالات سامنے آتے جن سے ان کی الجھن دُور ہو جاتی اور حنفی مسلک کی صداقت عیاں ہو جاتی۔ پھر بیدار ہوتے تو کتب حدیث میں دلائل بھی نظر آجاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوتا اور آپ کے ارشاد یا طرز عمل سے مسئلہ کی وضاحت ہو جاتی۔ بیداری کے بعد کتابوں میں تائیدی روایتیں بھی مل جاتیں۔ اس قسم کے واقعات بہت کم بیان کرتے تھے۔ زیادہ تر اخفائے حال کی کوشش کرتے تھے مگر کبھی کبھی درس میں بحث کے دوران کسی خواب یا مکاشفہ کا ذکر آجاتا تھا۔

مولانا نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی وہ حنفی نہ تھے۔ میاں نذیر حسین تو کھلے ہوئے غیر مقلد تھے۔ شیخ حُسین بھی حنفی مسلک سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ تمام ائمہ مذاہب کا احترام کرتے تھے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام ادب سے لیتے تھے مگر خود شافعی تھے اس لیے ان کے درس میں احناف کے دلائل کا وہ زور نہ تھا جس کی ایک حنفی سے توقع کی جاتی ہے۔ حدیث کی درسی کتابیں بھی عموماً محدثین یا شوافع کی لکھی ہوئی ہیں، ان کے مصنفین کو حنفیوں کے دلائل جمع کرنے کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اس لیے ان کی کتابوں کے سادہ مطالعہ کا اثر یہی ہوتا ہے کہ احناف کا مسلک کمزور معلوم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے لاہور میں مولانا غلام احمد سے فقہ و اصول کی کتابیں توجہ سے پڑھی تھیں بچپن سے جن بزرگوں اور استادوں کی خدمت میں رہے وہ بھی حنفی تھے اس خاندانی اور تعلیمی ماحول نے ان کے دل میں امام ابوحنیفہؒ سے غیر معمولی محبت و عقیدت پیدا کر دی تھی، اور انھیں احناف کی صداقت اور ان کے مسلک کی قوت کا یقین ہو گیا تھا۔ اگر حدیث کے اساتذہ حنفی ہوتے تو ان کی زبان سے اپنے خیالات کی تائید سن کر مطمئن ہو جاتے اور خود کسی کاوش میں مبتلا نہ ہوتے۔ مگر غیر حنفی اساتذہ کے درس میں ان کے سامنے حنفیوں کے جو دلائل آتے وہ زیادہ مضبوط نہ ہوتے اس لیے امام ابوحنیفہ کے ساتھ انھیں جو والہانہ عقیدت تھی وہ مجبور کر دیتی کہ خود ان کی تائید میں دلائل تلاش کریں۔ ان دلائل کو محدثین کے معیار پر جانچیں اور ائمہ جرح و تعدیل کے بیانات سے راویوں کی ثقاہت ثابت کریں۔ بھوپال میں شیخ حسین کے یہاں انھیں

اس کا پورا موقع ملا، حدیث کے متون اور ان کی مفصل شرحیں وہاں موجود تھیں۔ اسماء الرجال کی کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ تھا اور اصول حدیث کی متداول کتابوں کے علاوہ نادر مخطوطے بھی موجود تھے۔ اگر کبھی مطالب کے سمجھنے میں اشکال ہوتا تو وسیع النظر اور شفیق استاد کی اعانت ہر قدم پر حاصل تھی۔ بہر حال میاں نذیر حسین صاحب کے درس میں مولوی صاحب نے جو یہ دعوا کیا تھا کہ میں عالم پٹھان ہوں اس کو انھوں نے بھوپال کے قیام کے زمانہ میں صحیح ثابت کر دیا۔

مدارس میں عموماً حدیث شریف کے درس میں طلبہ عبارت پڑھتے ہیں، پھر استاد مطالب و مباحث پر مفصل و مدلل تقریر کرتا ہے اور اپنے بیان کے ثبوت میں جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کتابوں کے حوالے دیتا ہے کبھی کبھی کسی کتاب کو کھول کر دکھا بھی دیتا ہے۔ طلبہ استاد کی تقریر کو توجہ سے سنتے ہیں جو بات سمجھ میں نہیں آتی اسے استاد کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اگر کوئی بات وضاحت طلب ہوتی ہے تو استاد اسے واضح کر دیتا ہے۔ لیکن مولانا کا طریقہ درس اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ طلبہ کے سامنے عبارت کی تشریح، مطالب کی توضیح اور مباحث کی تفسیر ہی نہیں پیش کرتے تھے بلکہ طلبہ کو مآخذ سے بھی واقف کراتے تھے، ان کے مراتب ذہن نشین کراتے، ان کے مطالعہ کے آداب بتاتے اور ان سے استفادہ کا سلیقہ سکھاتے تھے۔ مآخذ و مراجع پورے طور پر ان کی نظر میں ہوتے تھے درسگاہ میں اپنے قریب حوالہ کی کتابیں رکھ لیتے اور جب مسئلہ پر بحث شروع ہوتی، تو وہ اپنی تقریر کے ساتھ ساتھ یہ کتابیں طلبہ کے حوالہ کرتے اور کہتے کہ انھیں خود پڑھو۔ اس سلسلہ میں صرف شروح پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اونچے سے اونچے مآخذ طلبہ کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ مثلاً صحیح بخاری میں کوئی اختلافی مسئلہ آجاتا تو صرف فتح الباری اور عینی ہی پر بس نہ ہوتی بلکہ امام شافعی کے نقطۂ نظر کو سمجھانے کے لیے ان کی "کتاب الام" پڑھاتے۔ امام مالک کے دلائل کے لیے "مدونہ" اور اس کی شرح پیش کرتے۔ اگر کبھی کوئی طالب علم درمیان میں کسی متاخر مصنف کا حوالہ دیتا، مثلاً یہ کہتا کہ اس بارے میں شاہ ولی اللہ نے یہ لکھا ہے یا مولانا عبدالحی کی یہ رائے ہے یا شاہ عبدالحق نے یہ کہا ہے تو فرماتے کہ متاخرین کا ذکر اس موقع پر کیوں کر رہے ہو صحیح بخاری ہمارے سامنے رکھی ہے، "کتاب الام" اور "مدونہ" یہ رکھی ہیں، متقدمین کی ان کتابوں کی موجودگی میں بعد کے آدمیوں کے حوالہ کی کیا ضرورت ہے۔

مولوی صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ جس وقت دلائل پیش کیے جا رہے ہوں اس وقت

اشخاص کا نام نہ لیا کرو حنفی مسلک کی تائید کے لیے وہ کبھی کسی حنفی مصنف کا حوالہ نہ دیتے بلکہ عموماً محدثین کی کتابوں ہی سے دلائل فراہم کرتے۔ نکات اور توجیہات کی طرف زیادہ میلان نہیں تھا بلکہ انداز بحث بالکل محدثانہ ہوتا تھا۔ مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ جن ابواب میں گمان بھی نہیں ہوتا تھا ان سے وہ اپنے مسلک کی تائید میں روایت نکال لیتے تھے۔ نماز کے اوقات، صلح حدیبیہ میں صحابہ کی تعداد، تراویح کی رکعات، صاع کی مقدار، تین طلاقوں کے حکم اور اسی طرح کے بیسیوں مسائل میں ان کی تلاش و تحقیق ان کی وسعت نظر کا پتا دیتی تھی۔ تحقیق کے میدان میں اپنے ہوں یا غیر کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی عقیدت کی بنا پر بے دلیل کسی کا دعوا تسلیم کرتے تھے۔ امام شوکانیؒ ان کے سلسلۂ سند میں تھے، صرف دو واسطوں سے شاگرد تھے لیکن بایں ہمہ ان سے بالکل مرعوب نہیں تھے مذاہب کے بیان میں دلائل پر ایک نظر پڑ جانے کے لیے "نیل الاوطار" طلبہ سے پڑھواتے لیکن ساتھ ساتھ اس کی کمزوریاں بھی واضح کرتے جاتے۔

سلسلۂ بحث میں اصول حدیث کے مباحث بھی زیر بحث آجاتے۔ اس بارے میں بھی ان کا ذوق بہت بلند تھا۔ اصول حدیث کی متداول کتابوں کے علاوہ نادر قلمی نسخے بھی ان کے پیش نظر ہوتے۔ اصولی مسائل میں بھی ان کا طریقہ یہی تھا کہ طلبہ کو خود سمجھنے اور رائے قائم کرنے کا موقع حاصل ہونا چاہیے۔ کہا کرتے تھے کہ پہلے مخالف کے دلائل پورے طور پر سمجھ لینا اور انھیں دوسروں کی زبان سے سننے کے بجائے خود مخالفین سے ہی سے معلوم کرنا چاہیے۔ فرماتے تھے کہ براہ راست ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بجائے جو لوگ ثانوی ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں بسا اوقات انھیں دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ مخالفین کی طرف ایسے خیالات منسوب کر دیتے ہیں جنھیں وہ تسلیم نہیں کرتے۔ طلبہ کو بڑی تاکید کرتے تھے کہ جس شخص کی تردید کر رہے ہو پہلے خوب تحقیق کر لو کہ اس کے اصل خیالات کیا ہیں۔ اسی بنا پر انھیں اپنے مسلک سے اختلاف رکھنے والوں کی تصانیف کی زیادہ فکر رہتی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا ان کی کتابیں حاصل کرتے اور شاگردوں کو ان کے مطالب اور دلائل سے مطلع کرتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ تمھارے سامنے مخالفین کے دلائل اور ان کے ماخذ وضاحت کے ساتھ آجائیں تاکہ تمھیں کبھی یہ گمان نہ ہو کہ مولوی صاحب اپنے مسلک کی کمزوری کی وجہ سے مخالفین کے دلائل چھپا گئے۔ ان کی اسی نصیحت سے ان کے شاگردوں

کو بے حد فائدہ پہنچا، اور بے تحقیق بات کہنے کی عادت نہیں پڑی۔ مولانا کے درس میں عجیب سماں ہوتا تھا۔ حدیث کے بڑے بڑے ائمہ کے خیالات سامنے آتے تھے اور ان کی اہم تصانیف اور ان کے طرزِ استدلال سے واقفیت ہوتی تھی۔ وہ حنفی مسلک کو اتنا مدلل کر دیتے کہ پھر کسی دوسرے کی تحقیق نگاہ میں جچتی نہیں تھی۔

اسماء الرجال کی کتابوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ یہاں بھی وہ متقدمین کی تصانیف کی فکر میں رہتے تھے۔ "میزان الاعتدال"، "تہذیب التہذیب"، "تذکرۃ الحفاظ" اور "لسان المیزان" کے اقوال تنقیدی نظر سے پڑھتے تھے، اور متقدمین کی کتابوں میں ان کی سند تلاش کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ آٹھویں صدی کے آدمیوں کا بیان پہلی اور دوسری صدی کے اشخاص کے بارے میں اس وقت قابلِ قبول ہو سکتا ہے جب اس کا ثبوت معاصرین کے یہاں مل جائے۔ فرماتے تھے کہ راوی کی توثیق و تضعیف اور حدیث کی صحت و ضعف خود ایک اجتہادی مسئلہ ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی راوی کو ایک محدث کسی وجہ سے ضعیف سمجھتا ہو اور دوسرے کے نزدیک وہ وجہ باعثِ ضعف نہ ہو۔ یہی حال حدیث کی صحت و ضعف کا ہے۔ اس لیے اسماء الرجال کی کتابوں میں صرف قوی و ضعیف اور ثقہ و غیر ثقہ دیکھ کر فیصلہ کر دینا محقق کی شان نہیں ہے۔ بلکہ راوی کے حالات کا تفصیل سے مطالعہ ضروری ہے۔ کہا کرتے تھے کہ مثلاً علامہ ذہبی یا حافظ ابن حجر کے نزدیک اگر کوئی راوی مجہول ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو متقدم مجتہد اس راوی سے روایت کر رہا ہے وہ بھی اس سے ناواقف ہو۔ ایک صاحبِ علم و نظر مجتہد جب کسی روایت پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتا ہے تو وہ روایت اس کے نزدیک ضرور صحیح ہوگی، ورنہ وہ اسے اپنے استدلال کی بنیاد کیوں بناتا۔ جان بوجھ کر ایک ضعیف روایت کو ماخذ بنانا اور ایک غیر معتبر راوی پر اعتبار کرنا مجتہد کی شان ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ دیانت کے بھی خلاف ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بسا اوقات لوگ اشخاص کے علم سے مرعوب ہو کر تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے یا فرطِ عقیدت کی بنا پر بے چون و چرا کسی کی بات مان لیتے ہیں، اس لیے غلطی کا ازالہ نہیں ہو پاتا۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابو بکرہؓ کی ایک روایت ہے۔

لقد نفعني الله بكلمة	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
سمعتها من رسول الله	میں نے ایک بات سنی تھی، اس نے
صلى الله عليه وسلم	مجھے جنگِ جمل کے زمانہ میں فائدہ

ایام الجمل بعد ما کدت ان	پہنچا یا جب کہ قریب تھا کہ میں جمل والوں
الحق باصحاب الجمل	کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔
فاقاتل معهم قال لما بلغ	(وہ بات یہ ہے) کہ جب نبی صلّی اللہ علیہ
النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم	وسلم کو اطلاع ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ
ان اهل فارس قد ملکوا	کی لڑکی کو اپنا حکمراں بنایا ہے تو آپؐ نے
علیهم بنت کسریٰ	فرمایا کہ وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی
قال لن یفلح قوم ولوا امرهم	جس نے اپنا حکمراں ایک عورت کو
امراۃ لہ	بنایا۔

عموماً اس روایت سے عورتوں کی امارت اور سرداری کا عدم جواز ثابت کیا جاتا ہے، لیکن اس وقت مولوی صاحب کو اس مسئلہ سے کوئی بحث نہیں تھی۔ ان کی ادب شناس نگاہ کو اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تنقیص نظر آئی اور فرمایا دیکھو تو راوی کس طرح ام المومنین حضرت عائشہؓ پر طنز کر رہا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو بخاری کی جلالت شان سے مرعوب ہو جاتا مگر وہ جانتے تھے کہ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں ان کے علاوہ کوئی کتنا ہی بڑا شخص ہو معصوم عن الخطا نہیں ہے، اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ ان کی نظر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عزت وحرمت راوی سے کہیں زیادہ تھی۔ اسماء الرجال کی کتابیں پاس ہی رکھی ہوئی تھیں، میزان الاعتدال اور تہذیب اٹھا کر دیں، اور فرمایا راویوں کی سرگزشت پڑھو کتاب کھولتے ہیں تو ایک راوی عثمان بن ہیثم کے متعلق ملتا ہے "ٹھیک نہیں ہے، غلطی بہت کرتا ہے۔ آخر میں اس کا یہ حال تھا کہ جو تلقین کر دی جاتی اسے قبول کر لیتا تھا۔" دوسرے راوی عوف کے متعلق اس سے بھی بڑھ کر لکھا تھا کہ وہ قدری اور شیعی تھا، شیعیت کا اظہار کرتا تھا۔ داؤد بن ہندا سے مارتے تھے، اور کہتے تھے، قدری! تیری ہلاکت ہو۔ ایک اور امام جرح وتعدیل کا بیان ہے، "کان قدریا... رافضیا شیطاناً" انھوں نے قدریت (اعتزال) اور رفض کے الزام کے علاوہ اسے شیطان بھی قرار دیا۔ ائمہ جرح وتعدیل نے یہ بھی کہا ہے کہ عوف حضرت حسن بصریؒ سے ایسی باتوں کی روایت کرتا تھا، جو اور کوئی نہیں بیان کرتا تھا

لے حدیث صحیح بخاری کے باب المغازی میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ الفاظ میں کسی قدر فرق کے ساتھ باب الفتن میں نیز صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ لیکن بخاری کی اہمیت بہرحال سب سے زیادہ ہے۔

اسماء الرجال کی کتابوں میں راویوں کا اعمال نامہ پڑھا جا چکا تو فرمایا کہ اس جرح بیّن (واضح اعتراض) کے بعد کسی کے محض ثقہ اور صادق کہنے سے راوی کی صفائی نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ عقیدۂ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مخالف ہے، اس لیے اس کی کوئی ایسی روایت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جس سے ان کی تنقیص ہوتی ہو۔ اس خیال کے ثبوت میں اصول حدیث کی کتابوں کی عبارتیں بھی دکھا دیں۔

مولوی صاحب کے فیضِ صحبت سے ان کے شاگردوں میں بھی اس طرز کی بصیرت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ سنن ابی داؤد کی کتاب الاشربہ کی اس روایت پر نظر پڑی کہ "تحریم خمر سے پہلے ایک مرتبہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی دعوت کی اور انھیں شراب پلائی اس کے بعد حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی اور نشہ کی وجہ سے قُل یاایہاالکافرون میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے۔ اس کے بعد لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کی آیت نازل ہوئی۔"

اس روایت کو پڑھ کر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے دل میں فوراً کھٹک پیدا ہوئی۔ اس وقت وہ مولوی صاحب سے حدیث کی اونچی کتابیں پڑھتے تھے۔ ابوداؤد کی اس روایت کو پڑھتے ہی انھوں نے کہا ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے، حضرت علیؓ تو شروع ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، نو برس کی عمر میں وہ اسلام لے آئے تھے، جو شخص بچپن سے آپ کی تربیت میں رہا ہو وہ شراب کے پاس جا بھی نہیں سکتا۔ بس پھر کیا تھا، تحقیق شروع ہو گئی۔ پتا چلا کہ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کے مختلف سلسلے نقل کیے ہیں، اور جس روایت میں حضرت علیؓ کے بارے میں شراب کا ذکر ہے اس کے مقابلہ میں ان روایتوں کو ترجیح دی ہے جن میں حضرت علیؓ کا ذکر نہیں ہے لیکن راوی پر جرح نہیں کی ہے، بلکہ وجہ ترجیح یہ بیان کی ہے کہ عطاء بن سائب سے ان روایتوں کو سفیان ثوری نے روایت کیا ہے، اور عطاء کے شاگردوں میں سفیان زیادہ قوی اور قابلِ اعتماد ہیں۔ لیکن اس سے بات کس طرح بن سکتی تھی۔ سفیان کے ذریعہ سے بعض روایات ایسی بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کے بارے میں شراب اور نشہ کا ذکر ہے۔ خود ابوداؤد کی مذکورہ بالا روایت عطا سے سفیان ہی روایت کر رہے ہیں۔ اصل میں غلطی ابوعبدالرحمٰن سلمی کی ہے، لیکن بخاری کے راوی اور تابعی کے بارے میں کون زبان کھولے۔ مگر مولوی صاحب کی تعلیم تھی کہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو اور اس راہ میں اشخاص سے مرعوب نہ ہو۔ حضرت علیؓ السابقون الاولون میں سے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص تربیت یافتہ اور خلیفۂ راشد ہیں، ان کی ذات اس تہمت سے بری ہے۔ ابوعبدالرحمٰن مجروح ہوتا ہے تو ہو، حضرت علیؓ کی ذات پاک پر کیوں حرف آئے۔

بات یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو فتنے برپا ہوئے، اور حضرت علیؓ جن مشکلات سے دوچار ہوئے، ان میں بہت سے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رہنا دشوار ہوگیا۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی بھی اس فتنہ کا شکار ہوگیا۔ وہ حضرت علیؓ کا مخالف ہوگیا، اور ان کی ذات کو ہدف ملامت بنانے لگا۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اسے عثمانی یعنی حضرت عثمانؓ کا طرفدار لکھا گیا ہے مگر دراصل وہ حضرت عثمان کا طرفدار نہیں بلکہ حضرت علیؓ کا شدید مخالف تھا۔ خود بخاری کی کتاب الجہاد میں اس کے متعلق ایک ریمارک موجود ہے، جس کے بعد اس کی مخالفت وعناد کے ثبوت کے لیے اور کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک بدری صحابی ہیں، فتح مکّہ سے پہلے انھوں نے قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کی اطلاع دے دی تھی، یہ آپ کی مرضی کے خلاف تھا۔ آپ نے حضرت علیؓ کو دو ایک آدمیوں کے ساتھ بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں، وہ گئے، ایک عورت ملی، مگر اس نے انکار کیا، جب انھوں نے سختی کی تو اس کے پاس سے خط برآمد ہوگیا۔ یہ خط جب مدینہ آیا تو آپ نے حاطب کو بلاکر پوچھا، انھوں نے عذر پیش کیا، حضرت عمرؓ کو بہت غصّہ آیا اور انھوں نے کہا کہ حضرت اجازت دیجیے تو میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپؐ نے فرمایا نہیں رہنے دو یہ بدری ہیں، اللہ نے ان کے گناہ معاف کردیے ہیں اور کہ دیا ہے کہ اعملوا ما شئتم (جو چاہو کرو)

ابو عبدالرحمٰن اس روایت کو حضرت علیؓ کے ایک معتقد سے بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں جو خوں ریزی ہوئی اس کا سبب یہی "جو چاہو کرو" ہے۔ اس کے الفاظ پڑھیے کتنا سخت طنز کر رہا ہے، علوی کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

انی لاعلم ما الذی جرّأ	میں خوب جانتا ہوں کہ تمھارے
صاحبك علی الدماء	صاحب (علیؓ) کو کس چیز نے خوں ریزی
(صحیح بخاری، کتاب الجہاد)	کی جرأت دلائی ہے۔

پھر پوری روایت بیان کرنے کے بعد ایک بار پھر اسی بات کا اعادہ کرتا ہے اور کہتا ہے

فهذا الذی جرأه	پس یہی وہ بات ہے جس نے ان کو جرأت دلائی ہے۔

اس دل خراش طنز کو نقل کرتے ہوئے امام بخاری سے ضبط نہ ہوسکا اور لکھ دیا فکان عثمانیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مخالف کی روایت حضرت علیؓ کے خلاف قابل قبول نہیں ہوسکتی ہے۔ مولوی صاحب کے محققانہ درس نے تنقید وتحقیق کا جو ذوق پیدا کردیا تھا اس کی اور بھی

مثالیں نقل کی جا سکتی ہیں، مگر مضمون بہت طویل ہو جائے گا، اس لیے نظر انداز کی جا رہی ہیں۔

مولوی صاحب عربی کے ادیب اور لغوی نہیں تھے، لیکن بعض اوقات مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے ایسے الفاظ آجاتے تھے جن کا مفہوم متعین کرنے میں اہلِ زبان مختلف الخیال ہیں۔ ایسے مواقع پر علمائے معانی و بیان اور ائمۂ لغت کی اہم تصانیف کھلتیں، کلامِ عرب سے استشہاد ہوتا، اور الفاظ کی حقیقت اور مختلف زمانوں میں ان کے استعمال کی تاریخ پر نظر ڈالی جاتی اور بڑی کدوکاوش کے بعد رائے قائم کی جاتی۔

مولوی صاحب کے درس میں حنفی، شافعی، اہلِ حدیث سبھی نقطۂ نظر کے طالب علم ہوتے تھے۔ ہر ایک کو بحث کی پوری آزادی ہوتی تھی۔ مولوی صاحب تاکید کرتے تھے کہ محض میری بات نہ مانو بلکہ دلائل کو سمجھ کر رائے قائم کرو۔ اس طرزِ عمل کا اثر یہ تھا کہ ان کے شاگرد کسی بڑے سے بڑے آدمی کی تقلید پر قناعت نہیں کرتے تھے۔ حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والے طلبہ بھی ان کی مجلس درس میں شریک ہو کر تقلیدی طور پر حنفی ہونے کے بجائے تحقیقی طور پر حنفیت اختیار کرتے تھے۔ مولوی صاحب ہاں میں ہاں ملانے والوں کے بجائے ان طالب علموں کی زیادہ قدر کرتے تھے جو غور و خوض اور بحث و تحقیق کے عادی تھے۔ سطحی نظر رکھنے والے ان کی بلندی تحقیق سے گھبراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اکابر کے متعلق بدظنی پیدا ہو جائے گی، لیکن یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ ان کے انتہائی عقیدت مند شاگردوں پر بھی کبھی یہ اثر نہیں ہوا۔ بزرگوں کی تعظیم، اسلاف کا احترام، محدثین کی عزت اور فقہا کا ادب ہمیشہ ملحوظ رہا، البتہ اکابر پرستی کی طرف کبھی میلان نہیں ہوا، اور دل میں یہ خیال جم گیا کہ اصاغر ہوں یا اکابر، متاخرین ہوں یا متقدمین عزت سب کی کرنا چاہیے، لیکن تقلید کے بجائے نظر ہمیشہ دلائل پر رہنا چاہیے۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ تعظیم و تکریم اپنی جگہ پر ہے اور بحث و تحقیق اپنی جگہ پر۔ دلیل کی راہ میں عقیدت کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ باپ ہو یا استاد، مرشد ہو یا محسن، ان کا احترام سر آنکھوں پر، لیکن ان کی باتوں کو سمجھنا، اور ان کے دلائل پر غور کرنا ایک طالبِ حق کے لیے ضروری ہے۔

مدرسین کے تقرر میں بھی وہ اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کے یہاں مدرسین کے لیے علمی استعداد ضروری تھی، اگر انتخاب کے موقع پر کوئی کہتا کہ فلاں بڑا دین دار ہے تو فرماتے دین دار تو سب کو ہونا ہی چاہیے، مگر دینداری کے ساتھ علمی کمال بھی ضروری ہے، اگر اس میں خامی ہے تو مدرسہ میں اس

کی جگہ نہیں ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ناظم ندوۃ العلما حکیم سید عبدالحی صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے مولانا حیدر حسن خاں کو پہچانا، اور ان کی قدر دانی انھیں یہاں لائی۔ جب تک حکیم صاحب زندہ رہے، انھیں برابر ان کی دلجوئی کا خیال رہا۔ مولوی صاحب بھی ان سے بہت مانوس تھے، اور وقتاً فوقتاً ان سے ملتے رہتے تھے۔ ۳ر فروری ۱۹۲۳ء کو اچانک حکیم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا کی طبیعت میں وہ انبساط باقی نہ رہا، مگر پھر بھی ندوہ کی خدمت میں لگے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں حسب معمول تعطیل کے زمانہ میں اپنے وطن ٹونک گئے، وہاں چھٹی کے آخری دنوں میں ان کے صاحبزادے سعید حسن خاں بیمار ہوگئے۔ مولوی صاحب نے رخصت کی درخواست بھیجی۔ ندوہ میں قاعدہ تھا کہ تعطیل کلاں سے متصل چھٹی نہیں دی جاتی تھی۔ ناظم صاحب کو بیماری کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں ہوا، اور انھوں نے رخصت منظور نہیں کی۔ نامنظوری کی اطلاع پہنچی تو صاحبزادہ کی حالت نازک تھی۔ مولوی صاحب کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی، اور انھوں نے استعفا بھیج دیا۔ سعید میاں کا اس بیماری میں انتقال ہوگیا، مولوی صاحب کو بے حد صدمہ ہوا، جوان وسعادت مند بیٹے کی موت زندگی بھر نہیں بھولی، جب کبھی ذکر آجاتا تو آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔

تقریباً دو سال وہ ٹونک میں رہے، اس اثنا میں وہاں قرأت کے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ انھیں فن قرأت سے بڑا شغف تھا، تجوید کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی، اور اس فن کی اونچی کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ وہ بڑے پر اثر لہجہ میں قرآن مجید پڑھتے تھے۔ ان کی تلاوت میں جو قرآن مجید رہتا تھا، اس میں حفص کی قرأت کے علاوہ دوسری قرائتیں بھی مختلف روشنائی سے درج تھیں، تاکہ ایک نظر میں ساری قرائتیں سامنے آجائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ علما اس جانب متوجہ ہوں۔ کم علم قاریوں سے مطمئن نہ تھے۔ تجوید کی جانب ان کی توجہ میں مزید اضافہ مولانا عین القضاۃ کے مدرسہ فرقانیہ کی وجہ سے ہوا کہ وہاں کے قاریوں میں وہ قاری عبدالمالک کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ قاری صاحب ٹونک کے مدرسہ فرقانیہ کی خدمت قبول کرلیں مگر مولانا عین القضاۃ کی زندگی بھر تو قاری عبدالمالک صاحب کہیں اور جانے پر آمادہ نہ ہوئے، لیکن مولانا کی وفات کے بعد مولوی صاحب کے اصرار کی وجہ سے وہ اس پر آمادہ ہو گئے، اور کئی برس تک ٹونک میں رہے۔

مولانا کے استعفا دینے کے بعد ندوہ میں شیخ الحدیث کی جگہ خالی ہوگئی۔ تقریباً دو سال

اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش ہوتی رہی، لیکن ناظم اور معتمد دار العلوم کی جد و جہد کے باوجود کوئی شخص ایسا نہ مل سکا جو حدیث شریف کی اس خالی مسند کو پُر کر سکتا۔ آخر ہر پھر کر مولانا ہی پر نظریں پڑنے لگیں۔ ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۸ء) میں شاید مارچ یا اپریل کا مہینا تھا کہ وہ قاری عبدالمالک کو لینے لکھنؤ آئے۔ قاری صاحب ٹونک کے مدرّ قرأت کے ممتحن تھے۔ خبر ملی کہ مولوی صاحب آئے ہیں اور شیخ خلیل عرب کے یہاں ٹھہرے ہیں، میں حاضرِ خدمت ہوا۔ مولوی صاحب بڑی محبت سے ملے اور دیر تک باتیں کرتے رہے آتنی مدت گزرنے کے بعد ساری گفتگو تو یاد نہیں رہی البتہ ایک بات آج تک یاد ہے۔ ذکر کچھ مقرر و مدرس کا تھا۔ فرمایا تقریر و تدریس میں بڑا فرق ہے۔ جو اچھا مدرس ہو گا وہ اچھا مقرر نہیں ہو سکتا، اسی طرح اچھا مقرر اور خوش بیان واعظ کامیاب مدرس نہیں ہو سکتا۔ دونوں کے معیار اور ذوق میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک کا کام علمی تحقیق ہے، اور دوسرے کی غرض دل پذیر انداز میں پبلک کی تفہیم ہے۔ اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جب عمر آگے بڑھی اور دونوں لائنوں کا تجربہ ہوا تو پتا چلا کہ مولوی صاحب نے کتنے تجربہ کی بات کہی تھی۔ بعض اوقات چوٹی کے واعظوں اور خطیبوں کو مسندِ درس پر دیکھا تو ان کی خوش بیانی اور نکتہ آفرینی طلبہ کے لیے وبالِ جان نظر آئی، اور جب کوئی مدرس محفلِ وعظ میں نظر آیا تو اس کا علمی اندازِ بیان مضحکۂ روزگار سمجھا گیا۔ ایک مرتبہ ایک بڑے مدرّس نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُوْمِنُوْن کی تفسیر مجمع عام میں بیان کی، انھوں نے فرمایا مومنو! خوش ہو جاؤ تمھاری کامیابی یقینی ہے دیکھتے نہیں ہو کہ ماضی پر "قد" داخل ہے۔ اس علمی نکتہ کو عوام کیا سمجھ سکتے تھے، سب ہنس پڑے، اور مدتوں یہ کہ کر ان کا مذاق اڑاتے رہے کہ ماضی پر قد داخل ہو گیا ہے۔

لکھنؤ کی اس آمد نے منتظمین ندوہ کو عرضِ معروض کا موقع دیا۔ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم اس کام پر مامور ہوئے۔ وہ مولوی صاحب کے مخلص دوست اور ان کے علم کے قدر داں، حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم کے صاحبزادے تھے، اس لیے وہ ان کی درخواست رد نہ کر سکے۔ اور جولائی ۱۹۲۸ء میں دوبارہ تشریف لے آئے۔

ان کی تشریف آوری سے دار العلوم میں پھر رونق آگئی، اور حدیث کے اسباق طلبہ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ مولوی صاحب کی تقریر میں زیادہ روانی اور خوش بیانی نہ تھی، اپنا مطلب سیدھی سادی زبان میں بیان کرتے تھے، مگر ان کا علم جلد ہی دلوں پر اپنا سکہ جما لیتا تھا۔ درس کے اوقات کے علاوہ بھی طلبہ ان کے یہاں جاتے تھے، اور ان کی نگرانی میں تحقیقی کام کرتے تھے۔ بعض مسائل پر مولوی صاحب

نے خود بھی لکھا تھا، مگر کوئی بڑی کتاب نہیں لکھی تصنیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی، مطالعہ اور تدریس ہی میں جی لگتا تھا۔ انتظامی کاموں سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ دراصل علمی انہماک کسی اور طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا، لیکن مولانا حفیظ اللہ صاحب کی سبکدوشی کے بعد ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں اہتمام کی ذمہ داریاں بھی ان پر پڑ گئیں تو انھوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں پورا کرنے کی کوشش کی حُسنِ اتفاق سے دفتری اور انتظامی کاموں کے لیے ان کو بڑے منتظم، خوش سلیقہ اور مستعد معاون مل گئے تھے۔ شروع میں مولانا محمد عمران خاں ندوی نے منصرم کی حیثیت سے انتظامی اور دفتری کاموں کو سنبھالا۔ ان کے مصر جانے کے بعد مولوی نجم الدّین احمد صاحب قدوائی اور افتخار حسین صاحب قدوائی نے یہ خدمت انجام دی۔ اس بنا پر اہتمام کے کاموں میں کبھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی، اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات خوش اسلوبی سے حل ہوتے رہے۔ مولوی صاحب کو اپنے ان معاونوں پر پورا اعتماد تھا، اور وہ لوگ بھی دل و جان سے ان کے خیر خواہ اور وفادار تھے۔

ماتحتوں کے ساتھ مولوی صاحب کا بڑا اچھا سلوک تھا۔ مدرسین ہوں یا دفتری کارکن اعلا ملازمین ہوں یا ادنا سب سے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے اور اپنے برتاؤ سے یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ کوئی افسر ہیں۔ ڈانٹنا تو بڑی بات ہے تیز گفتگو بھی شاید ہی کسی نے کبھی سنی ہو۔ ماتحتوں کی عزّت اور آزادی کا لحاظ رکھتے تھے اور دباؤ کے بجائے محبت سے کام لینے کے عادی تھے۔ ان کی شفقت و مہربانی کا اندازہ کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ ندوہ کے بعض اساتذہ اور کارکنوں نے اخوان الصفا کے نام سے ایک حلقۂ احباب قائم کیا تھا۔ مولانا محمد ناظم، مولانا محمد عمران خاں، مولوی نجم الدّین قدوائی، ماسٹر عبدالحق، مولانا ابوالحسن علی وغیرہ آٹھ دس اصحاب اس میں شامل تھے۔ ہر ہفتہ کسی نہ کسی کی طرف سے دعوت ہوا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی باری میں مولوی صاحب کو بھی دعوت دے دی۔ اس دن کسی ضرورت سے انھیں امین آباد جانا پڑا، اور اتفاق سے واپسی میں دیر ہوگئی۔ کوئی طنطنہ والا مہتمم ہوتا تو جب تک وہ آنہ جاتا کسی کو کھانا شروع کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ جب زیادہ دیر ہوئی تو مولوی صاحب کی شفقت کی بنا پر کھانا شروع کر دیا گیا۔ کھانے والے بے تکلّف کھاتے رہے، اور نکالنے والے جی بھر کر نکالتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پلاؤ زردہ اور دوسرے خاص کھانے سب ختم ہوگئے، اور صرف روٹیاں باقی رہ گئیں۔ اتنے میں مولوی صاحب آگئے، لیکن یہاں کیا رکھا تھا، سب چپ، لیکن وہ اندازہ سے صورت حال سمجھ گئے، اور ناراضگی کے بجائے ہمدردی کرنے لگے، پریشان نہ ہو، کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ

ہیں میرا لکھا تار کھا ہے، تم لوگ فکر نہ کرو۔ لیکن ہم لوگوں کو بہت شرمندگی تھی، رات زیادہ ہو چکی تھی، مگر حسن اتفاق سے اس زمانہ میں لکھنو میں نمائش ہو رہی تھی، وہاں کھانا مل گیا۔ جب کھانا لے کر ہم ان کی خدمت میں پہنچے تو فرمایا میاں اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت تھی، میں کوئی غیر نہیں ہوں، ایسی سردی میں تم لوگ اتنا کیوں دوڑے دیکھو تمھارے ہاتھ کیسے برف ہو گئے ہیں۔ وہ اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا غلطی ہم نے نہیں کی بلکہ انھوں نے کی ہے۔ وہ ماتحتوں کے ساتھ بالکل برابری کا برتاؤ کرتے تھے، بیماری دکھ درد، شادی غمی میں شریک ہوتے ندوہ کے ایک استاد مفتی محمد یوسف (انتقال ۱۹۳۴) بیمار ہوئے تو ایسی تیمارداری کی کہ انکے حقیقی عزیز بھی ویسی نہ کرتے۔ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کا انتقال ہوا تو تقریباً تیس میل کا سفر کر کے جنازہ میں شرکت کی۔ اس زمانہ میں بسیں نہیں چلتی تھیں، اسٹیشن سے نگرام تک آٹھ میل کے قریب پیدل گئے۔ ندوہ کے اساتذہ میں اکثر تو ان کے شاگرد تھے، لیکن جو شاگرد نہیں تھے وہ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ مولوی صاحب بھی سب کا خیال رکھتے۔ یوں تو سبھی کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا تھا، لیکن عربی کے استادوں میں شاہ حلیم عطا مرحوم اور انگریزی کے استادوں میں ماسٹر محمد سمیع صدیقی سے خاص تعلق خاطر تھا۔ ان کے علم، تجربہ اور صلاحیت کار کی بڑی قدر کرتے تھے، یہ لوگ بھی ان کے خلوص بزرگی اور حسن سلوک کے معترف تھے۔

امرا، اغنیا اور اصحاب وجاہت سے مولوی صاحب زیادہ تعلق نہیں رکھتے تھے۔ لیکن غریبوں اور معمولی حیثیت کے لوگوں سے ایسا برتاؤ کرتے کہ وہ ان کے گرویدہ ہو جاتے۔ بتن، ایک چائے فروش تھا، جو صبح کو ندوہ میں کشمیری چائے اور بالائی اور شام کو کھیر فروخت کرتا تھا مولوی صاحب اس سے دودھ لیتے تھے۔ لکھنو میں راجستھان کا سادودھ مشکل سے مل سکتا ہے، لیکن بتن کوشش کر کے خالص دودھ انھیں پہنچاتا تھا۔ اس کی اس خدمت سے وہ بہت متاثر تھے، اکثر اس طرح ممنونیت کا اظہار کرتے گویا انھیں بلا قیمت مل رہا ہے۔ اسی طرح ایک صاحب حافظ عبدالقیوم تھے، وہ دیہات سے گھی لایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب ان کی بڑی خاطر کرتے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ مولوی صاحب فرش پر بیٹھے مطالعہ کر رہے ہیں، اتنے میں حافظ صاحب آگئے تو فرمایا آرام کر لو۔ وہ بہتیرا عذر کرتے مگر جب تک ان کو لٹا نہ لیتے مولوی صاحب کو چین نہ آتا۔

مولوی صاحب امتیاز برتنے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ سفر و حضر ہر جگہ انھیں مساوات کا خیال رہتا۔ ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی لکھنو آئے ان سے ملاقات کے لیے منشی احتشام علی صاحب (معتمد مال، ندوۃ العلما) کی کوٹھی پر گئے۔ اس وقت ایک کرسی خالی تھی، مگر جب

تک اپنے ساتھ کے دو طالب علموں کے لیے بھی کرسیاں منگوا نہیں لیں خود نہیں بیٹھے۔ ۱۹۳۷ء میں ندوہ کے کام سے ان کے ساتھ مدراس تک جانے کا اتفاق ہوا، اس سفر میں میرے علاوہ مولانا ابوالحسن علی اور مولانا عمران خاں صاحب بھی ہمراہ تھے۔ مولوی صاحب خاصے ضعیف ہو چکے تھے۔ ہم لوگوں نے بہتیرا چاہا کہ ان کو اونچے درجہ میں بٹھا دیں مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، اور تیسرے ہی درجہ میں ہم لوگوں کے ساتھ رہے، کھانے پینے اور رہنے میں بھی کسی قسم کا امتیاز گوارا نہ کیا۔ ایک مرتبہ ایک تقریب کے سلسلہ میں ہمارے گانو (تھولینڈی ضلع رائے بریلی) گئے، اسٹیشن پر سواریاں کم تھیں، بہتیری کوشش کی گئی کہ وہ سواری پر بیٹھ جائیں مگر کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ فرمایا کیا میں کسی سے کمزور ہوں اور تین میل پیدل رات میں چلے گئے۔ اس دن کچھ بارش ہو گئی تھی سڑک کچی تھی، کہیں پانو پھسلتا تو فرماتے گرنے سے نہیں ڈرتا لیکن تاریخ بن جانے کا خیال ہے۔ گانو پہنچے تو لوگوں نے بہت چاہا کہ انھیں ممتاز جگہ پر بٹھائیں، مگر قالین اور گدے کا کیا ذکر ہے، انھوں نے کبھی کھری چارپائی پر بھی تنہا بیٹھنا پسند نہ کیا۔

فرماتے تھے کہ کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا۔ مہمانوں کی آمد سے بے حد خوش ہوتے ان کی بڑی خاطر کرتے۔ کوئی ان کا شناسا یا شاگرد اگر ان کے دسترخوان کے پر نہ پہنچتا تو بہت ناخوش ہوتے۔ جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں میں ایک مرتبہ لکھنؤ گیا، دو تین دن مولوی صاحب کے ساتھ کھانا کھایا۔ اتفاق سے قیام طویل ہو گیا میں ناغہ کرنے لگا وہ کھانے کے وقت تلاش کراتے ایک دن مل گیا تو فرمایا کہاں غائب رہتے ہو۔ میں نے عرض کیا قیام زیادہ دن رہے گا آپ کو کہاں تک زحمت دوں۔ فرمایا حضرت ہم پر رحم کیجیے، نہ آکر آپ ہمارا نقصان کرتے ہیں، ہمیں اتنا ہی ملتا ہے جتنا ہمارا خرچ ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسے مہمان بھی آجاتے جو کھانا بھی کھاتے اور چلتے وقت کرایہ بھی مانگتے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ وہ صاحب پشاور کے رہنے والے تھے۔ چلتے وقت کہا میرے پاس خرچ بالکل نہیں رہ گیا ہے کرایہ کا انتظام کر دیجیے گھر پہنچ کر منی آرڈر کے بجائے معذرت کا خط آیا مولوی صاحب اس معذرت پر بہت خوش ہوئے مجھے خط دکھایا، اور فرمایا دیکھو کتنا اچھا آدمی ہے، روپے نہ بھیج سکا تو معذوری کی اطلاع دے دی۔

ان کے یہاں جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور یونی ورسٹیوں کے پروفیسر بھی آتے رہتے تھے۔ پروفیسر محمود شیرانی تو ہم وطن تھے، لکھنؤ یونی ورسٹی کے لوگ پڑوسی تھے، ان کے علاوہ دوسری یونی ورسٹیوں کے اساتذہ بھی آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میری

موجودگی میں بنارس یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو مولوی مہیش پرشاد آئے تو ان کی بڑی خاطر کی۔ مہیش پرشاد صاحب پر ان کے اخلاق اور حسن سلوک کا بہت اثر ہوا اور کہنے لگے مولانا آپ جیسے بزرگوں کے برتاو نے میرے دل میں اسلام سے محبت پیدا کی ہے۔

مولوی صاحب حنفی تھے اور اپنے مسلک پر مستحکم تھے، مگر دوسرے مسلک و مذہب کے لوگوں کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ علمائے اہل حدیث سے بڑی بشاشت سے ملتے اور انکے کاموں کی قدر کرتے۔ نواب صدیق حسن خان کی علم دوستی کی بڑی تعریف کرتے، اور کہتے کہ انھوں نے حدیث کی نایاب کتابیں چھپوا کر اہل علم کو پہنچائیں۔ مولانا بشیر احمد سہسوانی کی اتباع سنت سے بہت متاثر تھے۔ ایک مرتبہ مسواک کی تاکید کی حدیثیں پڑھی جارہی تھیں۔ فرمانے لگے مولانا بشیر احمد سہسوانی پان نہیں کھاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ مسواک کے مقصد کے خلاف ہے۔ اسی طرح ٹونک کے سید عرفان اور سید مصطفےٰ کی بے حد تعریف کرتے تھے، اور سنت نبوی کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی کے واقعات بڑے کیف کے ساتھ سناتے تھے۔ مولانا محمد سورتی کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات تھے۔ خود ان کے شاگردوں میں متعدد اشخاص اہل حدیث تھے، ان سے بڑی محبت سے ملتے اور خاطر مدارات کرتے۔ شیخ تقی الدین ہلالی ندوہ میں کئی سال شیخ الادب رہے، بڑے کٹر سلفی تھے، ان سے بہت اچھے روابط تھے، وہ موجود ہوتے تو اصرار کرکے نماز میں انھیں کو امام بناتے۔ ان معاملات میں وہ بڑے فراخ دل اور وسیع الظرف تھے۔ تعصب اور زبان درازی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے، حنفی، شافعی، اہل حدیث غرضیکہ جو مسلک بھی آدمی کو پسند ہو اختیار کرے لیکن دوسروں کی دل آزاری، ان کے اماموں اور بزرگوں کی توہین اور ان کے مذہب پر طعن و تشنیع جائز نہیں۔ دلائل و براہین سے اپنے خیالات کی صحت ثابت کرنے کی اجازت ہے، مخالف کی غلطی واضح کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ادب و تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔

شاگردوں سے بڑی شفقت و محبت کا برتاو کرتے تھے، انھیں اپنی اولاد پر ترجیح دیتے تھے، اور ان کی سود و بہبود کی ہمیشہ فکر رکھتے تھے۔ کسی شاگرد کی آمد کی خبر سنتے تو ملاقات کے لیے بے چین ہو جاتے۔ بسا اوقات فرط محبت میں اس کے گھر پہنچ جاتے، پھر اسے اپنی قیام گاہ پر لاتے اور جب تک بس چلتا اس کو اپنا مہمان رکھتے۔

بڑے نامور شاگردوں کا ذکر نہیں مجھ جیسے حقیر اور بے مایہ شاگردوں کے ساتھ جو

سلوک کرتے تھے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ خود بیانی معیوب نہ ہوتی تو بہت سے واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں، صرف مولوی صاحب کی شفقت و محبت اور عنایت و حسن سلوک کا اندازہ کرنے کے لیے چند باتیں لکھی جا رہی ہیں۔

رمضان کی تعطیل میں گھر جا رہا تھا، جی چاہا کہ زیلعی کی "نصب الرایہ" ساتھ لیتا جاؤں، فرصت میں کچھ پڑھ ڈالوں گا۔ اس وقت تک ڈابھیل والا نیا اڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، کتاب بہت کمیاب تھی۔ مولوی صاحب کے پاس بہت پرانا بوسیدہ نسخہ تھا۔ میں نے ان سے کتاب مانگی، فرمانے لگے میاں یہ کتاب مجھے بے حد عزیز ہے، مگر تم اس سے بھی زیادہ عزیز ہو، لے جاؤ۔ ایک مرتبہ مجھے قرض کی ضرورت ہوئی، مولوی صاحب سے کچھ روپے لیے۔ جب واپس کرنے گیا تو فرمایا میں نے واپسی کے لیے روپے نہیں دیے تھے، یہ ملازمت کی ذلت میں نے تمھیں لوگوں کے لیے گوارا کی ہے۔ جامعہ کی طالب علمی کے زمانہ میں خاص طور سے وہاں ملنے کے لیے گئے۔ میرے اور رئیس احمد جعفری مرحوم کے صحیح بخاری کے کچھ حصے درس میں باقی رہ گئے تھے، ان کو پورا کرنے کے لیے گرمی کی تعطیل میں ٹونک نہیں گئے، اور لکھنؤ میں مئی جون کی تپش میں کتاب پڑھائی، اور پھر اپنی دستخطی سند حدیث عطا فرمائی، جو ہم لوگوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ اس زمانہ میں ان کے گھٹنے میں شدید درد تھا، ہفتوں بے چین رہے مگر اس تکلیف کے باوجود کئی کئی گھنٹے سبق پڑھاتے۔ مولوی صاحب حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی طرف سے صاحب اجازت تھے، مگر کم لوگوں کو بیعت کرتے تھے لیکن کمال شفقت کی بنا پر مجھے، رئیس احمد اور عبدالرشید نعمانی کو بیعت سے مشرف فرمایا۔ نعمانی جے پور کے رہنے والے تھے، کئی سال سفر و حضر میں مولوی صاحب کے ساتھ رہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کئی برس ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستہ رہے۔ لغات القرآن کی کئی جلدیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں کچھ عرصہ نیو ٹاؤن کراچی کے دارالعلوم سے متعلق رہے پھر جامعہ عباسیہ بھاولپور میں حدیث کے استاد مقرر ہوئے، متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے سنن ابن ماجہ کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

میں اپریل ۱۹۳۶ء میں ندوہ میں ملازم ہو کر آیا تو تنخواہ بہت کم تھی۔ مولوی صاحب نے پلنگ، دری، لالٹین اور دس روپے عنایت کیے اور جب تک ضرورت کے مطابق تنخواہ میں اضافہ نہیں ہو گیا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے رہے۔ تعطیل میں گھر گئے تو وہاں سے منی آرڈر بھیجا تاکہ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ لکھنؤ میں جب تک رہے برابر خیال رکھا، اور جب ٹونک چلے گئے تو وہاں سے بھی میرے

حالات دریافت کرتے رہتے۔ میرے ساتھیوں میں رئیس صاحب کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی، اور مولانا عبدالرشید نعمانی پر خاص عنایت تھی۔ مولانا عبدالرشید نعمانی نے حدیث شریف کے ساتھ تصوف وسلوک میں بھی ان سے فیض حاصل کیا تھا، اور اب بھی تدریس وتصنیف کے ذریعہ استاد کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کے بعد مولانا محمد زکریا صاحب سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

مولوی صاحب نے پُرانے زمانہ میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن آگے چل کر تجربہ نے زمانہ کے حالات سے واقف کر دیا تھا۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے ملنا جُلنا بھی ہوتا تھا اس بنا پر وہ نئے زاویۂ نظر کو کسی قدر سمجھنے لگے تھے، اسی وجہ سے بعض ایسے مسائل میں جن کی بحث وتنقیح سے عُلما اب تک فارغ نہیں ہوئے ہیں، وہ واضح رائے رکھتے تھے۔ تار اور ٹیلیفون پر رویت ہلال کی اطلاع کو وہ جائز سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں مطلع صاف نہ تھا تو مفتی کفایت اللہ کو تار دے کر دریافت کیا اور اس پر عمل کیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر نماز بالکل جائز سمجھتے تھے۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت کے قائل تھے۔ بڑھاپے میں اور دوسرے مشاغل کے ساتھ انگریزی پڑھنے کا موقع کہاں تھا، لیکن چکوں پر دستخط کر لیا کرتے تھے، اور چند ضروری جملے بول بھی لیتے تھے۔ ٹری نداد (ویسٹ انڈیز) کا ایک لڑکا ندوہ میں داخل ہوا تھا اور ان کے کمرے ہی میں رہتا تھا۔ وہ اردو نہیں سمجھتا تھا اس سے حسب ضرورت دو چار جملے انگریزی میں بول لیتے تھے۔ انگریزی کی تحصیل کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ کہتے تھے طالب علمی کے زمانہ میں اندازہ نہیں ہوا ورنہ میں اسے بھی پڑھ لیتا۔ عربی مدارس کے طلبہ کو خاص طور سے اس جانب توجہ دلاتے تھے۔ اس زمانہ میں پنجاب یونی ورسٹی کے امتحانات کے ذریعہ انگریزی تعلیم کا آسان راستہ نکل آیا تھا، ان کے کئی شاگردوں نے اس طرح ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ خود ان کے بڑے لڑکے مولانا سعد حسن نے علوم اسلامیہ کی تحصیل و تکمیل کے بعد اسی طرح بی۔ اے پاس کیا۔ لیکن جدید تعلیم کے ساتھ وہ دینی زندگی اور اسلامی شعائر میں ذرا سی غفلت اور کوتاہی کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ "درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق" کے قائل تھے، اور "جام وسندان باختن" کو مردانگی سمجھتے تھے۔ ندوہ کے بانیوں نے دین و دُنیا کی ہم آمیزی کا جو تخیل پیش کیا تھا اس کی قدر کرتے تھے۔ لیکن کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے لے بھاگنے کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ دونوں پہلوؤں میں کمال حاصل کرنے کے خواستگار تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ تھوڑا علم نقصان پہنچاتا ہے۔

اب عمر پچھتر سے متجاوز ہو چکی تھی، اگرچہ وہ اب بھی ضعف و انحطاط کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اور جوانوں کی جوانی پر طنز کرتے رہتے تھے۔ کسی محنت طلب کام سے ہم لوگ اعراض کرتے تو کہتے کیسے جوان ہو۔ ہم لوگ عرض کرتے مولوی صاحب جوانی آئی کہاں بچپن کے بعد ہی بڑھاپا آگیا تو مسکراتے اور اپنے شباب کے قصے بیان کرنے لگتے۔ لیکن عمر بہر حال کافی ہو چکی تھی، قویٰ کمزور ہو گئے تھے، اور جوانی کی یاد جوان نہیں کر سکتی تھی۔ عمر کی اس منزل میں قوت بخش دواؤں سے تقویت پہنچائی جاتی ہے، مگر وہ اس جانب متوجہ نہ تھے۔ عزیزوں، دوستوں اور مہمانوں پر سیکڑوں روپے خوشی سے خرچ کر دیتے تھے، لیکن اپنی دوا کے لیے دو چار روپے کا صرف بھی ناگوار ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم نے ان کی حالت دیکھ کر ایک دوا لکھ دی۔ مولانا ابو الحسن علی ساتھ تھے، وہ دوا لے کر آئے، پوچھا کتنے کی ملی، یہ سن کر کہ اس کی قیمت چار روپے ہے، فرمایا فوراً واپس کرو، میں اپنی جان پر چار روپے نہیں صرف کر سکتا، بہتیری کوشش کی گئی کہ راضی ہو جائیں مگر کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً دوا واپس کر دی گئی۔

یہی حال اپنی ذات کے لیے غذا کے اہتمام کا تھا۔ ضعف بڑھتا رہا، آخر عمر میں کبھی کبھی چکر بھی آجاتا تھا۔ ان حالات کی بنا پر ان کو گھر کا خیال آنے لگا، لڑکے اور عزیز بھی اس پر زور دیتے تھے۔ ایک طرف یہ صورت حال تھی، دوسری طرف لکھنؤ میں ان کے قدرداں بھی دنیا سے اٹھتے جا رہے تھے۔ ندوہ کے ماحول کو بھی اب وہ اپنے حسب حال نہیں پاتے تھے۔ بعض ارکان کا طرز عمل بھی ان کو پسند نہ تھا۔ مزاج میں اگرچہ انکسار اور فروتنی بہت تھی، لیکن اس کے ساتھ خودداری اور عزت نفس کا خیال بہت تھا۔ استخفاف اور اہانت کا ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا تو بے حد رنج و تکلیف محسوس کرتے، وہ متکبر کے سامنے انکسار کے قائل نہ تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ متکبر کے مقابلہ میں تکبر ہی تواضع ہے۔ ایک طرف ان کے احساس کی نزاکت کا یہ حال تھا، دوسری طرف ارکان ندوہ میں جو لوگ ان کے قدرداں اور مرتبہ شناس تھے، ان میں سے اکثر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، یا ازکار رفتہ ہو چکے تھے۔ ایسے اشخاص کم رہ گئے تھے جو ان کے علم کی گہرائی، نظر کی وسعت، فکر کی بلندی، اور تحقیق کی ندرت کا پورا اندازہ کر سکتے۔ ان کا طرز تدریس بے حد مفید تھا، پچاس ساٹھ سال کا تجربہ اس کی تصدیق کر رہا تھا، لیکن اس کے افادہ کی پیمائش منٹوں اور صفحوں سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ مدرس اپنے مضمون کو سمجھتا ہے، وہ اپنے طالب علموں کی استعداد بھی جانتا ہے اسے موقع و محل کا اندازہ ہوتا ہے، مباحث

اس کی نظر میں ہوتے ہیں، وہ ان کے بحث کرنے کے ڈھنگ سے واقف ہوتا ہے، اور بحث کے پھیلانے اور سمیٹنے کے مواقع سے آگاہ ہوتا ہے۔ اچھا استاد بے محل وضاحت اور بے جا اختصار سے اجتناب کرتا ہے، وہ محفلِ وعظ اور مجلسِ درس کے فرق کو سمجھتا ہے، لیکن یہ باتیں ایسے لوگوں کو کس طرح سمجھائی جائیں جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم نہیں رکھا ہے۔ وہ اہلِ علم وکمال کا احترام کرتے تھے، اور ان کے مشوروں کو سرآنکھوں پر رکھتے تھے، مگر جو لوگ راہِ علم کے شہ سوار نہیں تھے، اور جنھیں درس وتدریس کا پورا تجربہ نہیں تھا وہ ان کی باتوں کو لائقِ التفات نہیں سمجھتے تھے۔ مولوی صاحب قواعد وضوابط کا احترام کرتے تھے اور نظم وانتظام کے بھی قائل تھے، مگر مدرسہ کو ضابطہ گاہ اور قانون گھر نہیں، بلکہ دارالعلوم سمجھتے تھے۔ بالکل یہی خیال ایک مرتبہ ایک یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی زبان سے سُننے میں آیا۔ مولوی صاحب قانون کے بجائے اخلاق سے کام لیتے تھے، اور زبان کو خاموش کرنے کے بجائے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جو لوگ زجر وتوبیخ اور عقوبت وتعزیر ہی کو اصلاحِ حال کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہ ان کی اس مصلحانہ حکمت اور حکیمانہ مصلحت کو مفید نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کے اندر انتظامی صلاحیت نہیں ہے، اور قانون سے کام لینا نہیں جانتے ہیں۔ یہ سُن کر انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ میں ایک درسگاہ کا سربراہ ہوں، کسی کوتوالی کا کوتوال نہیں ہوں، میں استادوں اور طالب علموں کی خدمت اور رہنمائی کے لیے آیا ہوں، چوروں اور ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کے لیے نہیں۔

مولوی صاحب مدرسہ کو مدرسہ سمجھتے تھے۔ وہ علم کی بالادستی کے قائل تھے۔ ان کی نظر میں درسگاہ کی روحِ رواں طلبہ اور اساتذہ ہی ہوتے ہیں، سارا اہتمام وانتظام انھیں کی خدمت کے لیے ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے یہی سیکھا تھا، لیکن انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اب رنگِ محفل بدلتا جا رہا ہے۔ ارکان بہرحال اربابِ بست وکشاد تھے۔ گو ابھی مولوی صاحب کے سامنے کسی کو کھل کر بالادستی کے اظہار کی ہمت نہ تھی، مگر بعض لوگ کچھ مشورے دینے لگے تھے۔ ان میں کبھی کبھی کسی قدر تنقید کا رنگ بھی آجاتا تھا۔ انھیں یہ باتیں ناگوار ہوتیں، کبھی برداشت کرلیتے اور کبھی جواب دے دیتے۔ آخر کار انھوں نے علاحدگی کا فیصلہ کرلیا، اور ۲۷ر ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ (۲۸ر دسمبر ۱۹۳۹ء) کو ملازمت سے استعفا دے دیا۔

مولوی صاحب نے حالات کا صحیح اندازہ کرلیا تھا۔ ان کی قدردانی کی وہ کیفیت نہ تھی جو پہلے تھی۔ ان کی اہمیت اور ضرورت بھی ویسی محسوس نہ ہوتی تھی، جیسے پہلے محسوس کی جاتی تھی۔ یہی

وجہ تھی کہ نہ ان کو روکنے کی کوئی خاص کوشش ہوئی نہ ان کو پھر بلانے کے لیے جد وجہد کی گئی۔ مولوی صاحب کو ہمیشہ یہ باتیں یاد رہیں، ٹونک پہنچنے کے بعد مجھے جو خط لکھا اس میں ان تلخیوں کے ذکر کے بعد لکھا کہ خدا کا شکر ہے، کہ میں ناگواریوں سے نجات پاکر وطن اور اعزہ کے خوشگوار ماحول میں آگیا ہوں۔ آخر میں یہ آیت لکھی تھی، جس سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ	خدا کا شکر ہے، جس نے ہم سے غم
عَنَّا الْحَزَنَؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ	دور کیا، بے شک ہمارا پروردگار
شَكُوْرُۙ ۝ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ	بخشنے والا قدردان ہے، جس نے ہم کو
الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖۚ لَا	اپنے فضل سے مستقل قیام گاہ میں
یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا	ٹھہرایا، یہاں ہم کو نہ تو رنج و محن پہنچے گا،
یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝	اور نہ ہمیں یہاں خستگی اور تکان ہوگی۔

(سورۂ فاطر نمبر ۳۵، آیت ۳۴، ۳۵)

ٹونک پہنچ کر ان کی خلش دور ہوگئی۔ خدمت گزار لڑکوں، جان نثار عزیزوں، ہمدرد دوستوں، اور قدرشناس ہم وطنوں کے درمیان ان کو سکون و اطمینان محسوس ہوا۔ اگرچہ عمر خاصی ہو چکی تھی لیکن ان کی بلند ہمتی اب بھی سپر افگندگی کے لیے آمادہ نہ ہوتی تھی، مگر پیرانہ سالی کے عوارض جو لکھنؤ ہی میں شروع ہو چکے تھے، برابر بڑھتے رہے، اور طبیعت کسلمند رہنے لگی۔ علاج معالجہ، دیکھ بھال اور خاطر مدارات کا بہترین انتظام تھا، گھر والے ہمہ وقت خدمت گزاری اور راحت رسانی کی فکر میں لگے رہتے تھے، لیکن صحت میں جو انحطاط شروع ہو چکا تھا، وہ رک نہ سکا، اور آہستہ آہستہ ضعف بڑھتا گیا، بالاخر وقت موعود آپہنچا، كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔ لکھنؤ سے جانے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد طبیعت زیادہ خراب ہوئی، اور ۱۵ رجمادی الاخری ۱۳۶۱ھ (۳۰ رجون ۱۹۴۲ء) کو بندہ اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہوگیا۔

جسدِ خاکی موتی باغ ٹونک میں سپرد خاک کیا گیا، اس وقت ہجری سن کے حساب سے اسّی سال کی عمر تھی۔

وفات کے وقت بڑے صاحبزادے مولانا سعد حسن خان اور چھوٹے قاری اسعد حسن خان موجود تھے۔ یہ لوگ کئی برس تک ٹونک ہی میں رہے۔ پھر جب ملک تقسیم ہوا تو دیگر عزیزوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے اور اپنے متعلقین کے ساتھ وہیں آباد ہوگئے ان کے ایک قریبی عزیز

مفتی ولی حسن خان بھی پاکستان میں ہیں اور دارالعلوم نیو ٹاؤن کراچی میں تدریس و افتاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ فقہ کی کتابوں پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے، اور بڑے ذی علم اور صاحب بصیرت مفتی سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ اعزہ ہندستان میں بھی ہیں۔ شاگرد مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ان کی کوئی مفصل فہرست اب تک مرتب نہیں ہو سکی ممکن ہے اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس کی کوئی صورت نکل آئے۔

مولوی صاحب کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے بعد اُن کے شاگرد حدیث کا درس دیتے رہیں تاکہ فیوض و برکات کا یہ سلسلہ جاری رہے اس طرح ان کا روحانی رابطہ بھی قائم رہے گا، اور ان کی روح کو ثواب بھی پہنچتا رہے گا۔

(معارف۔ جون، جولائی، اگست ۱۹۷۵ء)